دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۱۹۳ ماہ جمادی الاولی ۱۴۳۵ھ مطابق ماہ مارچ ۲۰۱۴ء عدد ۳

مجلس ادارت

(مرتبہ)

اشتیاق احمد ظلی
محمد عمیر الصدیق ندوی

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

فہرست مضامین

شذرات ۱۶۲
اشتیاق احمد ظلی

مقالات
دعوت نبویؐ پر قریشی اکابر کا ردعمل سماجی و تجزیاتی مطالعہ ۱۶۵
پروفیسر ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی
بریلی میں اردو شاعری کا ارتقاء (۱۷۴۹ء تا ۱۹۴۹ء) ۱۸۷
سید لطیف حسین ادیب
شیخ مبارک بودلےؒ جائسی ۲۰۳
محسن عتیق خان

اخبار علمیہ ۲۲۷
ک، ص اصلاحی

معارف کی ڈاک
شہزادی جہاں آرا بیگم ۲۳۰
عارف نوشاہی

آثار علمیہ و تاریخیہ
تعطیل جمعہ کے سلسلہ میں علامہ شبلی کی ایک نادر تحریر ۲۳۱
اشتیاق احمد ظلی

مطبوعات جدیدہ ۲۳۵
ع-ص

رسید مطبوعہ کتب ۲۴۰

شذرات

عروس البلاد ممبئی سے علامہ شبلی کو بڑا تعلق خاطر تھا۔ وہاں کی معتدل آب و ہوا اور پرسکون ماحول ان کو پسند تھا۔ شمالی ہند کے سخت موسم سے بچنے کے لیے وہ اکثر بمبئی کا رخ کرتے تھے۔ وہاں ان کو یکسوئی سے کام کرنے کا موقع ملتا تھا۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کو ایک خط میں لکھتے ہیں: ''سیرت کے اتمام کے لیے یہیں کی خاموشی اور سکون درکار ہے۔ دن بھر کوئی جھانکتا تک نہیں۔ اس لیے ارادہ تو یہ ہے کہ جلد اول ہمہ جہت تیار کر کے اٹھوں''۔ بمبئی کو یہ فخر حاصل ہے کہ سیرۃ النبیؐ کی نہ صرف ابتدائی سطریں یہاں لکھی گئیں بلکہ اس کے بڑے حصے کی تسوید بھی یہیں ہوئی۔ غالباً بمبئی سے ان کے اسی تعلق خاطر کا تصرف تھا کہ علامہ شبلی صدی کے تعلق سے پہلا گ پروگرام منعقد کرنے کا شرف اسی شہر کو حاصل ہوا۔ ممبئی کے محبان شبلی نے 'یاد شبلی کمیٹی' کے نام سے ایک کمیٹی کی تشکیل کی اور ڈاکٹر شیخ عبداللہ کو اس کا کنوینر مقرر کیا گیا۔ اس کمیٹی نے ۲۰۱۴ء کے دوران علامہ شبلی کی شخصیت، علمی اور ملی خدمات اور ان کے مشن کے تعارف کے مقصد سے مہاراشٹرا کے مختلف شہروں میں مجلس مذاکرہ منعقد کرنے کا پروگرام بنایا۔ اس سلسلہ کا پہلا مذاکرہ ۲۲ فروری کو ممبئی میں منعقد کیا گیا۔ اس مذاکرہ کا اہتمام انجمن اسلام، رحمت فاؤنڈیشن، مولانا عبدالسلام ندوی فاؤنڈیشن، چاند میاں دادا میاں تھانہ والا میموریل ٹرسٹ اور مجروح اکیڈمی کے تعاون سے کیا گیا۔ یہ پروگرام الاّ نا ملٹی پرپز ہال، انجمن اسلام کمپلکس میں منعقد کیا گیا اور بمبئی کے محبان شبلی نے بڑی تعداد میں اس میں شرکت کی۔ صدارت کے فرائض انجمن اسلام کے صدر ڈاکٹر ظہیر قاضی صاحب نے انجام دے اور نظامت محترمہ سلمی لوکھنڈ والا نے کی۔ ڈاکٹر شیخ عبداللہ نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا۔ علامہ شبلی کو خراج عقیدت پیش کرنے اور ان کی گوناگوں خدمات اور تعلیمات سے روشناس کرانے کا فریضہ انجام دینے والوں میں جناب شمیم طارق، جناب الیس علی شمسی، جناب ابوصالح انصاری اور راقم حروف شامل تھے۔ انجمن اسلام کی طالبات نے علامہ شبلی کی مشہور نظم 'شہر آشوب اسلام' اور 'مشغلہ تکفیر' بڑے موثر انداز میں پیش کی۔ ڈاکٹر ظہیر قاضی صاحب نے اپنے صدارتی خطاب میں ذمہ داران انجمن اور علامہ شبلی کے قریبی تعلقات کا ذکر کیا۔ اس مناسبت سے انہوں نے شبلی شناسی کے فروغ کے لیے انجمن کی طرف سے شبلی مرکز قائم کرنے کا اعلان کیا۔ امید کی جانی چاہیے کہ یہ مرکز جلد قائم کیا جائے گا اور مطالعات شبلی کے فروغ میں اہم کردار ادا کرے گا۔ ملک وملت کے اس عظیم محسن کو خراج عقیدت پیش کرنے کے تعلق سے 'یاد شبلی کمیٹی' کی یہ پہل ایک اہم ابتداء کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ملک کے دوسرے حصوں میں اور خاص طور سے ان شہروں میں جہاں سے علامہ شبلی کا خاص تعلق رہا ہے، ان کو خراج عقیدت پیش کرنے اور ان کی خدمات کے تعارف کے لیے علمی مجالس کا اہتمام کیا جائے گا۔ زندہ قوموں کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ وہ اپنے محسنوں کو یاد رکھتی ہیں۔

یہ بڑا خوش گوار اتفاق ہے کہ علامہ شبلی صدی کے تعلق سے منعقد ہونے والا دوسرا پروگرام بھی ممبئی کے

حصہ میں آیا۔ممبئ یونیورسٹی کے شعبہ فارسی کے زیر اہتمام ۲۴-۲۵ فروری کو ’’علامہ شبلی اوران کی فارسی خدمات‘‘ کے موضوع پرایک دوروزہ سمینار کا اہتمام کیا گیا۔اس سیمینار کی ڈائریکٹر ڈاکٹر سکینہ امتیاز خان تھیں جن کی کوشش سے اس سمینار کا انعقاد ممکن ہوا۔افتتاحی اجلاس جے۔ پی۔ نائک بھون میں منعقد ہوا۔اس میں جناب محمودالرحمٰن، سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوئے۔کلیدی خطبہ فارسی زبان و ادب کے معروف اسکالر پروفیسر شریف حسین قاسمی، سابق صدر شعبہ فارسی، دہلی یونیورسٹی نے پیش کیا۔مقالہ خوانی کے تین اجلاس منعقد ہوئے اوران میں علامہ شبلی کی فارسی خدمات کے مختلف پہلوؤں پر دس مقالے پیش کیے گئے۔ صدارت کے فرائض جناب ابوصالح انصاری، ڈاکٹر خورشید نعمانی اور ڈاکٹر زینت اللہ جاوید نے ادا کیے۔اختتامی اجلاس کی مہمان پروفیسر ہویوالا، سابق چیر پرسن، سنٹر فار یزشین، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دہلی تھیں۔مقالات پیش کرنے والوں میں یہ اسکالرس شامل تھے۔ڈاکٹر شائستہ خان، شبلی نعمانی - فارسی ادب کے آئینہ میں؛ ڈاکٹر خورشید نعمانی، علامہ شبلی کی عصری معنویت؛ ڈاکٹر زینت اللہ جاوید، شبلی نعمانی کا تاریخی اور تنقیدی شعور؛ ڈاکٹر رئیس انصار، علامہ شبلی ایک اجمالی جائزہ؛ ڈاکٹر انجم صباتاجی، شعرالعجم - شعرفہمی کا بےنظیر وسیلہ؛ محمد یحییٰ جمیل، شبلی نعمانی کی شاعری - ان کے شعری نظریات کی روشنی میں؛ ڈاکٹر شہناز پروین، شعرالعجم - ایک مختصر جائزہ؛ اخترالنساء، شبلی نعمانی پر ایک نظر؛ ڈاکٹر عرفان احمد، حکیم ابوالقاسم فردوسی از نظر شبلی؛ ڈاکٹر عبداللہ امتیاز احمد، شبلی کی فارسی غزل گوئی۔ افتتاحی اجلاس اور دوسرے اکیڈمک اجلاسوں میں فطری طور پر فارسی شاعری پر علامہ شبلی کی شاہ کار تصنیف شعرالعجم کا ذکر غالب رہا۔اس سمینار کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ علامہ شبلی صدی کے تعلق سے منعقد ہونے والا یہ پہلا سمینار ہے۔ یہ ممبئ یونیورسٹی کے شعبہ فارسی کی ایک اہم پہل ہے۔

امارات کے اعلیٰ علمی اور تحقیقی اداروں میں موسسۃ جمعۃ الماجد للثقافۃ والتراث (Juma Al Majid Center for Culture and Heritage) کو ایک امتیازی مقام حاصل ہے۔دبئ جدید دنیا کا ایک عجوبہ ہے جہاں سیاحوں کی دلچسپی کا وافر سامان موجود ہے۔لیکن اس خیرہ کن مظاہر اور مناظر والے شہر میں علم و تحقیق، نئ پرانی کتابوں اور وثائق اور انسانی تہذیب وتمدن کی باقیات سے دلچسپی رکھنے والوں کی منزل مراد علم و دانش کا یہی مرکز ہے جس کی زیارت کے بغیر ان کا اس خطہ کا سفر نامکمل ہی سمجھا جائے گا۔علم وتحقیق کا یہ عظیم الشان مرکز دبئ کی ایک علم دوست اور مخیّر شخصیت کی ذاتی دلچسپی اور کوشش کا ثمرہ ہے جس کی زندگی کا مشن علم کی خدمت اور لکھے ہوئے لفظ کی حفاظت ہے۔ان کے نزدیک ہر کتاب کی اپنی اہمیت ہے اور وہ جہاں کہیں بھی ہو اس کی حفاظت کی جانی چاہیے۔ شیخ جمعۃ الماجد کا شمار دبئ کی اہم ترین شخصیات میں ہوتا ہے۔وہ ایک بڑے اور کامیاب تاجر ہیں۔جمعۃ الماجد گروپ آف کمپنیز کے چیرمین ہیں۔دبئ کے متعدد اہم مالی اور تجارتی اداروں کی تاسیس میں ان کا کردار کلیدی اہمیت کا حامل رہا ہے۔مبدأ فیض سے انہیں ایک حساس اور دردمند دل عطا ہوا ہے۔وہ معاشرہ کے کمزور اور محروم طبقات کی مشکلات اور مسائل کا ادراک رکھتے ہیں اور ان کے ازالہ کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔اس مقصد سے

انہوں نے متعدد تعلیمی اور خیراتی ادارے قائم کیے جن میں جمال عبدالناصر سکنڈری اسکول، آمنہ سکنڈری اسکول، نیشنل چیرٹی اسکولس، اسلامک اینڈ عربک اسٹڈیز کالج اور بیت الخیر شامل ہیں۔ان میں سے زیادہ تر کمزور طبقات کے بچوں کی تعلیمی ضروریات کی کفالت کے لیے قائم کیے گئے ہیں۔دوسرے عرب اور اسلامی ممالک میں انہوں نے جو ادارے قائم کیے ہیں وہ ان کے علاوہ ہیں۔لیکن ان کا سب سے بڑا کارنامہ اور سب سے بڑی علمی خدمت موسستہ جمعۃ الماجد للثقافۃ والتراث کی تاسیس ہے۔یہ ادارہ انسانی تہذیب وثقافت کی حفاظت کی ایک عظیم الشان کوشش سے عبارت ہے۔مطبوعات، مخطوطات اور انسانی تہذیب وثقافت سے تعلق رکھنے والی دوسری نایاب ونادر اشیاء کی بحالی اور ان کی حفاظت اس کا مقصد ہے اور اس کے لیے ہر وہ انتظام کیا گیا ہے جو جدید سائنس فراہم کرسکتی ہے۔دنیا بھر میں بکھرے ہوئے مخطوطات کے عکس حاصل کرنے کی مسلسل کوشش اس ادارہ کو مخطوطات کے ایک بے مثال مرکز میں تبدیل کررہی ہے۔ساتھ ہی یہ مرکز طلبہ، محققین اور اسکالرز کو بہترین خدمات فراہم کرتا ہے اور مطالعہ وتحقیق میں ان کو ہر ممکن مدد فراہم کرتا ہے۔شیخ جمعۃ الماجد اس عظیم الشان علمی تحریک کے قائد بھی ہیں اور روح رواں بھی۔ان کی عمر اسی سال سے تجاویز کرچکی ہے لیکن وہ اب بھی پوری تندہی اور سرگرمی سے اپنے مشن کی تکمیل میں مصروف ہیں۔مخطوطات کی تلاش وجستجو میں انہوں نے بہت سے ممالک کا سفر کیا ہے۔جہاں کہیں ان کو مخطوطات کا سراغ ملتا ہے وہ ان کے حصول کے لیے سرگرم ہوجاتے ہیں اور دور دراز ممالک تک خود پہنچتے ہیں۔اس علمی مرکز کو دیکھنے اور اس کے علمی اور تحقیقی منصوبوں سے آگاہ ہونے کا موقع چند سال پہلے مل چکا تھا۔گذشتہ دنوں جب چند روز دبئی میں قیام کا اتفاق ہوا تو خوش قسمتی سے شیخ جمعۃ الماجد سے ملاقات اور باہمی دلچسپی کے امور پر کسی قدر تفصیل سے گفتگو کا موقع ملا۔ان کی شخصیت میں تواضع، انکسار اور اعلیٰ اخلاق کا بڑا خوبصورت امتزاج نظر آیا۔دل ودماغ پر اس ملاقات کا بڑا دیرپا نقش قائم ہوا۔

کانت محادثۃ الرکبان تخبرنا عن جعفر ابن فلاح اطیب الخبر
فلما التقینا فلا واللہ ما سمعت اذنی باحسن مما قد رای بصری

ایسے لوگوں سے مل کر اخلاقی زوال کے اس زمانہ میں انسانیت اور انسانی اقدار پر اعتماد بحال ہوتا ہے اور یہ احساس ہوتا ہے کہ ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں۔اس ملاقات میں میرے ساتھ ڈاکٹر محی الدین غازی تھے۔موسسہ کے ذمہ داروں میں ڈاکٹر عزالدین بن زغیبہ اور جناب ہاشم ندوی بھی موجود تھے۔یہ دونوں حضرات اکیڈمی کے قدردان ہیں اور ان کی وساطت سے موسسہ اور اکیڈمی کے درمیان باہمی تعاون کی شکلیں پیدا ہوئی ہیں۔گذشتہ دنوں موسسہ کی طرف سے اکیڈمی کو نہایت گراں قدر کتابوں کا تحفہ ملا جن کی شدید ضرورت کے باوجود ہم ان کی فراہمی سے قاصر تھے۔شیخ جمعۃ الماجد اور اکیڈمی کے ان بہی خواہوں نے یقین دلایا ہے کہ اکیڈمی کے ساتھ تعاون کا سلسلہ جاری رہے گا۔اس کے لیے ہم صمیم قلب سے شکرگزار ہیں۔موسسہ کا تفصیلی تعارف انشاءاللہ آیندہ کبھی کرایا جائے گا۔

مقالات

دعوتِ نبویؐ پر قریشی اکابر کا ردعمل
سماجی تجزیاتی مطالعہ

پروفیسر ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی

(۲)

اکابر قریش کی جوار مسلم: انسانی فطرت اور عرب شجاعت اور قریشی تمکنت کا ایک عجیب و غریب معاملہ جوار مسلم کے ضمن میں ملتا ہے۔ایک طرف تو مخالفت اسلام میں پیش پیش تھے اور رسول اکرمؐ کے علاوہ اپنے فرزندوں اور عزیزوں کے لیے بلائے درماں تھے۔دوسری طرف وہ اپنے بعض عزیزوں اور دوسرے صحابہ کرام کو اکابر و متشددین سے بچانے کے لیے جوار و تحفظ بھی دے دیتے تھے۔مہاجرین حبشہ میں بہت سے حضرات صحابہ کو مکہ واپسی پر انہوں نے اپنی جوار دے دی تھی اور ان کا بساط بھر تحفظ کیا تھا۔اس کا ایک مختصر بیان پہلے دیا جاتا ہے تجزیہ واپس آنے والوں کے حوالے سے بعد میں کیا جائے گا۔بلاذری کا بیان یہ ہے:

۱-ابواحیحہ سعید بن العاص اموی نے حضرت عثمان بن عفانؓ کو پناہ دی تھی اور اس کا باقاعدہ حرم مکہ میں اعلان کیا تھا۔ ۲-عتبہ بن ربیعہ عبشمی نے اپنے فرزند مسلم حضرت ابوحذیفہؓ کو تحفظ فراہم کیا تھا۔ ۳-نضر بن حارث بن کلدہ نے اپنے عزیز عمیر کے فرزند حضرت مصعب بن عمیرؓ کو اپنی جوار میں لے لیا تھا۔ ۴-زمعہ بن اسود نے حضرت زبیر بن عوامؓ اسدی کو تحفظ و جوار دیا تھا۔ ۵-اسود بن عبد یغوث نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کو اپنی پناہ میں لے لیا تھا۔ ۶-ولید بن مغیرہ مخزومی نے حضرت عثمان بن مظعون جمحیؓ کو جوار دی تھی۔ ۷-عاص بن وائل سہمی

ادارہ علوم اسلامیہ/شاہ ولی اللہ دہلوی ریسرچ سیل، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

نے حضرت عامر بن ربیعہ عنزی حلیف خطاب بن نفیل عدوی کو جوار میں لیا تھا۔ ۸- سہیل بن عمرو عامری نے حضرت ابوسبرہ بن ابی رہمؓ کو جوار دی تھی اور بعض کے مطابق ابی بن شریق ثقفی نے دی تھی۔ ۹- حویطب بن عبدالعزیٰ نے حضرت حاطب بن عمروؓ کو اپنی جوار فراہم کی تھی۔ ۱۰- بنوفہر کے خاندان نے حضرت سہیل بن بیضاءؓ کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا۔ ۱۱- عاص بن وائل سہمی نے حضرت عمر بن خطاب عدویؓ کو از خود اپنی جوار میں لیا تھا اور اس کا اعلان بھی کرا دیا تھا۔ ۱۲- مطعم بن عدی نوفلی نے ابوطالب کی وفات کے بعد رسول اکرمؐ کو آپ کی درخواست پر جوار فراہم کی تھی۔(۳۱)

مسلمانوں کے جوار و تحفظ کی یہ صرف چند مثالیں ہیں۔ بلا تامل و تکلف کہا جا سکتا ہے کہ بہت سے صحابہ اکابر قریش کی جوار میں رہتے تھے۔ جوار و پناہ دینے کے عرب و قریشی اصول کو ان کی مروت و شجاعت پر ضرور مبنی قرار دیا جاتا ہے کہ طلب جوار کا انکار نامردی تھی۔ لیکن اسی کے ساتھ کہیں نہ کہیں ان کے دلوں میں قومی یگانگت اور خاندانی محبت اور صلہ رحمی کے جذبات و اقدار کام کر رہے تھے۔ خاص طور سے ان اکابر قریش کا رویہ خاصا عجیب و غریب ہے جو اپنے فرزندوں اور عزیزوں کے لیے تو موذی اور ظالم و ستمگر تھے اور دوسرے خاندان کے مسلمانوں کے لیے مظالم کے خلاف سینہ سپر ہو گئے تھے۔ ان کا ایک مختصر تجزیہ بہت اہم حقائق بتاتا ہے۔

ابواحیحہ سعید بن العاص اموی اپنے مسلم فرزندوں پر سخت مظالم ڈھاتا تھا اور شروع میں حضرت عثمان بن عفانؓ کے قبول اسلام پر سخت ناراض ہوا تھا۔ وہ رسول اکرمؐ کی بت پرستی پر تنقید سے بہت جز بز ہوتا تھا مگر قومی و خاندانی نظام کی وجہ سے حضرت عثمان کو بعد ہجرت حبشہ جوار دے دی تھی اور پانچ سات سال تک ان کی اور ان کے خاندان کی حفاظت کرتا رہا تھا۔ بعد میں وہ اسلام کی مقبولیت اور رسول اکرمؐ کی کامیابی سے اتنا بیزار ہوا کہ وطن مالوف چھوڑ کر طائف میں اپنے احوال میں جا بسا۔ سہیل بن عمرو عامری خطیب و شیخ قریش اول الذکر کی مانند اپنے فرزندوں کے لیے تیغ ستم تھا مگر حضرت ابوسبرہؓ کو جوار میں لے لیا تھا۔ عتبہ بن ربیعہ عبشمی اکابر مکہ و قریش میں سب سے زیادہ شریف النفس، صلح پسند اور قومی فخر کے پیکر ہونے کے علاوہ حامی رسولؐ بھی تھے۔ اختلاف دین و ایمان کے باوجود اپنے مسلم فرزند اور عظیم صحابی حضرت ابوحذیفہؓ کو جوار میں لے لیا تھا۔ مسلم پسر کی جوار پدر کی یہ انوکھی مثال تھی۔ نضر بن حارث عبدری کو بلاذری وغیرہ نے

رسول اکرمؐ کے شدید ترین دشمنان قریش میں شمار کیا ہے جو تکذیب وتعذیب دونوں کا خوگر تھا۔ وہ صاحب احادیث اور ایرانی کتب کا پارکھ اور علمائے یہود ونصاریٰ سے مخالطت بھی رکھتا تھا اور قریشی اکابر میں عالم سمجھا جاتا تھا۔ تمامتر علمی مخالفت ونبوی عداوت کے باوجود اس نے حضرت مصعب بن عمیرؓ کو جوار دی تھی۔ غالباً عبدری حمیت نے زور مارا تھا۔ زمعہ بن اسود بن مطلب عامری معتدل وصلح کل قسم کے اکابر قریش میں سے تھا اور وہ حضرت زبیر بن عوام اسدیؓ کا محافظ بن گیا تھا۔ اسود بن عبد یغوث بن وہب زہری کو مستہزئین میں شمار کیا گیا ہے اور غالباً قومی حمیت سے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف زہریؓ کو پناہ دی تھی۔ ان خاندانی محافظوں کے ساتھ پورے خاندان بنو حارث بن فہر نے اجتماعی طور سے حضرت سہیل بن بیضاء فہریؓ کو پناہ دی تھی۔ وہ اکابر صحابہ کا خاندان تھا۔ ولید بن مغیرہ مخزومی اور عاص بن وائل سہمی عظیم ترین اکابر قریش میں تھے اور خاصے انصاف پسند، دونوں نے بالترتیب حضرت عثمان بن مظعون جمحیؓ اور حضرت عامر بن ربیعہ عنزیؓ حلیف حضرت عمر خطاب کو پناہ دی تھی۔ موخرالذکر نے حضرت عمرؓ کو بھی جوار دی تھی اور حق مسلم کا دفاع کیا تھا۔ حویطب بن عبدالعزیٰ خاندان ابوقیس بن عبدود کے منصف مزاجوں میں سے تھے، انہوں نے حضرت حاطب بن عمروؓ اور حضرت ابوجندلؓ کو بعد میں پناہ دی تھی۔ مطعم بن عدی نوفلی رسول اکرمؐ کے چچا تھے اور اکابر قریش میں اعتدال وانصاف اور حمایت وحمیت کے پیکر۔ جوار نبویؐ ان کا کارنامہ ہے۔ (۳۲)

صحیفہ مقاطعہ کے اکابر قریش: تاریخی سلسلۂ واقعات کی دوسری کڑی بنو ہاشم وبنو مطلب کے سماجی مقاطعہ (بائیکاٹ) کی لعنت تھی۔ وہ ہجرت حبشہ کے بعد خاص کر ان کے بیشتر مہاجرین کی واپسی اور ان کے مختلف اکابر قریش کے جوار میں داخلہ کے بعد پیش آئی تھی۔ اس کا عام زمانہ ۶ نبوی/۶۱۶ سے ۹ نبوی/۶۱۹ متعین کیا جاتا ہے جب تشدد پسند اور جابر اکابر قریش نے یہ اقدام کیا تھا۔ ان کا محرک صرف یہ تھا کہ ابوطالب ہاشمی اور ان کے دونوں مذکورہ بالا خاندانوں نے کسی طرح رسول اکرمؐ کو ان کے حوالے کرنے سے انکار کیا تھا۔ ابوطالب اور ان کے حامی خاندانوں کے علاوہ بیشتر اکابر قریش اور ان کے خاندان وبطون عرب روایات کے مطابق کارفرما تھے، کیونکہ اپنے "آدمی" کا دوسروں کے حوالے کرنے کا کام کلنک کا ٹیکہ تھا اور عرب شجاعت وپامردی

اورحمیت کے خلاف تھا۔ جبکہ مقاطعہ کرنے کے حامی اور ہم نوا اپنی اقدار حمیت وقبائلی محافظت کی خلاف ورزی کرکے ہٹ دھرمی اور بے جا ضد پر اڑے ہوئے تھے۔ ابن اسحاق /ابن ہشام، بلاذری وغیرہ کی روایات مختلفہ کا اتفاق ہے کہ دربار نجاشی میں وفد قریش کی ناکامی نے ان کی آتش غضب بھڑکادی تھی۔

تمام مآخذ سیرت وحدیث کا اتفاق ہے کہ چند ''جباروں'' اور ''شیاطین'' قسم کے امراء نے یہ منصوبہ بنایا تھا۔ بیشتر اکابر وشیوخ قریش ومکہ اس کے خلاف تھے لیکن وہ ان کے جبر وسرکشی کے سامنے بول تو سکے مگر کارگر مخالفت نہ کرسکے۔ مگر مآخذ سیرت اوران کے پیروکار مولفین سیرت یہ غلط تاثر دیتے ہیں کہ وہ قریش کا قومی واجماعی فیصلہ تھا اور کوئی اس کے خلاف نہ تھا۔ بہرحال کتابت صحیفہ اوراس کے نفاذ کے متعلق روایات میں یہی خیال باطل ملتا ہے اور نقض صحیفہ سے متعلق روایات اسے غیر متفقہ بتاتی ہیں اوران اکابر قریش اوران کے خاندانوں کا ذکر کرتی ہیں جو صحیفہ مقاطعہ جیسی غیر انسانی اور عرب مروت کے خلاف چیز کے خلاف تھے۔ جارح اور جنگ جو اکابر قریش میں سے بھی چند نے زورزبردستی اور قومی مفادات کا تحفظ بنا کر اس کو لکھا اور نافذ کیا تھا۔ ان میں بنو ہاشم کے شیخ ابولہب نے خاندانی اور قبائلی حمیت کے خلاف مقاطعہ کے حامی اکابر قریش کا ساتھ دیا تھا اور مورد طعن بھی بنا تھا۔ اوران سب معاندین کا سرخیل ابوجہل مخزومی تھا۔ دوسرے حامی صحیفہ اکابر قریش میں منصور بن عکرمہ عبدری کا نام آتا ہے جو کاتب صحیفہ تھا۔ دوسرے اکابر قریش ومکہ کا بالعموم ذکر نہیں کیا جاتا۔ ان کے بارے میں مزید تحقیق سے تشدد پسند اکابر کے طبقہ کا پتہ چلایا جاسکتا ہے۔(۳۳)

حدیث نقض الصحیفہ (مقاطعہ کے صحیفہ کی منسوخی) باب میں ان اکابر قریش کا ذکر ملتا ہے جو اس کے مخالف تھے اور بالآخر ان کی ہی کوششوں سے مقاطعہ کی منسوخی کا عمل صورت پذیر ہوا اور بنو ہاشم وبنو مطلب کا دور ابتلا تمام ہوا۔ منسوخی صحیفہ کا کارنامہ انجام دینے والے ہشام بن عمرو بن ربیعہ عامری تھے جو نضلہ بن ہاشم بن عبد مناف کے بھتیجے اور بنو ہاشم کے ''واصل'' تھے۔ وہ صاحب شرف وجاہ سردار تھے اورانہوں نے سب سے پہلے اس کے منسوخ کیے جانے کی تحریک چلائی اور متعدد اکابر کو ہم نوا بنالیا۔ وہ باری باری سے اپنے ہم خیال اکابر قوم کے پاس گئے اوران کو منسوخی

صحیفہ کے لیے تیار کیا۔اس باب میں وہ ایک کارفرما و کارگذار طبقۂ اکابر بنانا چاہتے تھے تا کہ ان کی اجتماعی قوت کے آگے مفسدان قوم و معاندین نبوی بے بس و غیر موثر ہو جائیں۔ابن اسحاق نے اپنے مخصوص افسانوی انداز میں بیان کیا ہے کہ وہ باری باری سے اکابر سے ملتے اور ان کو اپنے اقدام کا ہم نوا بناتے رہے۔وہ کم از کم پانچ اکابر کا طبقہ بنانا چاہتے تھے جو مختلف خاندانوں سے ہوں تا کہ ان کی اجتماعی قوت سے شدت پسند طبقہ لوہا نہ لے سکے۔ہشام بن عمرو عامری سب سے پہلے زہیر بن ابی امیہ مخزومی کے پاس گئے اور ان سے جذباتی اپیل کی کہ ”ہم تو کھانے کھائیں، عمدہ لباس پہنیں، عورتوں سے نکاح کریں اور عیش و عشرت میں مگن رہیں اور ہمارے اخوال اور اعزہ کھانے پینے کو ترسیں اور محرومی کا شکار رہیں“۔زہیر بن ابی امیہ مخزومی نے اپنی تنہائی کا شکوہ کیا تو ہشام عامری نے اپنی حمایت کا یقین دلایا اور تیسرے شیخ ہم نوا تلاش کرنے کو کہا۔ہشام عامری نے اسی طرح باری باری سے دورہ کر کے مطعم بن عدی نوفلی، ابوالبختری بن ہشام، زمعہ بن اسود کو ہم نوا بنایا۔پانچ پاک نفوس یا صاحبان خیر و مروت نے خطم الحجون نامی مقام پر رات میں مجلس مشاورت منعقد کی اور نقض صحیفہ کا فیصلہ کیا۔دوسری صبح زہیر بن ابی امیہ مخزومی نے خانہ کعبہ کا طواف کرنے کے بعد اکابر قریش کی مجالس (اندیۃ) کے سامنے نقض صحیفہ کا اعلان کیا۔ابوجہل مخزومی نے ان کی مخالفت کی کہ صحیفہ مقاطعہ منسوخ نہیں کیا جائے گا۔اس کی تردید میں زمعہ بن اسود نے دل کی بات کہہ دی کہ ہم تو اس صحیفہ کی کتابت پر راضی نہ تھے اور اسی طرح ابوالبختری، مطعم بن عدی نے اس کے نقض پر اصرار کیا اور واضح کیا کہ ہم سب تو اس سے کبھی راضی نہیں رہے۔انہوں نے دراصل خاموش اکثریت اکابر کی دل کی بات کہہ دی تھی۔پھر صحیفہ چاک کر دیا گیا۔یہ اقدام مطعم بن عدی نے کیا تھا اور اس کو ابوطالب وغیرہ نے بہت سراہا اور ان کی خاص طور سے تعریف و تحسین بھی ایک قصیدہ میں کی۔(۳۴)

قریشی اکابر کے طائفہ خمسہ نے معاہدہ و صحیفہ مقاطعہ جو خانہ کعبہ کے در میں آویزاں تھا، چاک کر دیا اور ان کے ساتھ بعض دوسرے اکابر قریش ہتھیار زیب تن کر کے شعب بنی ہاشم گئے اور محصوروں کو تلوار کے سائے میں ان کے گھروں میں لائے۔ان میں عتبہ بن ربیعہ اور عدی بن قیس سہمی بھی شامل تھے۔موخر الذکر کو ابوحسان کی کنیت سے مصادر میں یاد کیا جاتا ہے۔مآخذ کے مطابق نقض صحیفہ اور بنو ہاشم و بنو مطلب کی اپنے گھروں واپسی دیکھ کر شدت پسندوں اور دشمنوں

کے چھکے چھوٹ گئے ۔ اگر چہ روایات میں ''قریش'' کے بدحواس ہونے کا عمومی ذکر ہے اور وہ راویوں کی بے احتیاطی اور عمومی نگارش کا ایک نمونہ ہے ۔ اس کا ردعمل قریش یا ان کے جابر سرداروں پر یہ ہوا کہ وہ خود لاچار ہو گئے اور سمجھ گئے کہ اب مظلوموں کے خاندان (عشائر) ان کی حفاظت کریں گے اور ان کے رسول اکرمؐ کے ان کے حوالے کرنے کا خواب چکنا چور ہو گیا ۔ وہ حامی و موافق اکابر کی فتح تھی اور شدت پسند اور انتہا پسند شیوخ کی شکست تھی ۔ اب قریشی حامی اور معتدل اکابر کا سماجی غلبہ تھا ۔ بلاذری وغیرہ کے مطابق یہ اہم ترین قریشی کارنامہ نبوت محمدیؐ کے دسویں برس پیش آیا تھا اور کرب و بلاء کا دور ختم کر دیا گیا تھا ۔ (۳۵)

تین سالہ مقاطعہ کے دوران اکابر قریش کے دو طبقات نظر آتے ہیں : انتہا پسند جو مقاطعہ کا کلی نفاذ چاہتے تھے ۔ دوسرے صلح کل اور مروت و اخوت اور قبائلی یگانگت کے علمبر دار اکابر جو شروع سے مخالف تھے اور محصوروں کی مدد کیا کرتے تھے ۔ ان میں حضرت حکیم بن حزام اسدی ، ابوالبختری اور دوسرے قریشی اکابر و اعزہ شامل تھے اور وہ کھانا جیسی ضروریات فراہم کرتے تھے ۔ حضرت حکیم بن حزام اسدی اونٹنی پر آٹے (دقیق) کی بوریاں لاد کر شعب محاصرہ میں ہانک دیتے تھے تا کہ رسد کی کمی زیادہ نہ ہو ۔ ان کے علاوہ دوسرے اکابر قریش تھے جو سامان رسد کی فراہمی کرتے رہتے تھے اور صحابہ کرام بھی اپنی بساط بھر امداد کرتے تھے ۔ اگر چہ اس زمانۂ ابتلاء میں صحابہ کرام کی امداد و اعانت اور سالمیت و معاونت کا ذکر مآخذ کی روایات میں نہیں ملتا ۔ حضرات صدیق و فاروق اور عثمان و عبدالرحمٰن جیسے جری اور جاں نثار صحابہ کرام کسی طرح خاموش نہیں بیٹھ سکتے تھے ۔ روایات کا یہ خلا ہے مقاطعہ کے محاصرہ سے بعض اکابر ہاشم و مطلب باہر بھی آتے تھے اور سامان رسد کی خرید کرتے تھے اور کبھی ناکام بھی لوٹتے تھے ۔ حضرت عباس بن عبدالمطلب ہاشمی کی ایسی ہی کوشش کا ذکر ملتا ہے ۔ حیرت ہے کہ ابوطالب ہاشمی کے اقدامات مردانہ کا حوالہ نہیں آتا ۔ قریشی اکابر میں دوسرے بھی صلہ رحمی کرتے رہتے تھے اور ابوجہل مخزومی جیسے دشمنوں سے لوہا لیتے رہتے تھے ۔ ان کا سماجی رویہ باعث فخر تھا ۔ (۳۶)

علمی مخالفت اکابر: قریشی اکابر و شیوخ میں متعدد ایسے دوربیں اور صاحب نظر بھی تھے جو علمی اور دینی بنیادوں پر مخالفت کرتے تھے ۔ ان کی مخالفت و اختلاف کے تین زاویے تھے : ایک

رسول اکرمؐ کی نبوت ورسالت کے انکار میں دلائل دیتے تھے۔دوسرے قرآن مجید کی وحی الٰہی پر نقد کرتے تھے اور تیسرے عام اسلامی تعلیمات پر طنز وتعریض کے علاوہ سوالات کرتے تھے۔مآخذ نے اس ضمن میں متعدد اکابر قریش کا ذکر کیا ہے اوران کی تمام تنقیدات وطنزیات کو بسااوقات نقل بھی کیا ہے۔اکابر قریش خود دینی اور علمی مسائل نہ اٹھا پاتے تو یہود ونصاریٰ خاص کر احبار مدینہ سے علمی و تنقیدی امداد لیا کرتے تھے۔تمام فکری ودینی الزامات کا مقصود صرف یہ تھا کہ رسول اکرمؐ کو سچا رسول، اسلام کو سچا دین اورقرآن کو سچی وحی نہ مانیں اورلوگوں کو سمجھائیں کہ وہ سب سچ نہیں ہے۔ان میں سے بعض صاحب افکار وعلوم اپنے کلام کو بہتر ثابت کرتے اور یہودیت وغیرہ کو ترجیح دیتے۔

ابن اسحاق/ابن ہشام نے خاص طور سے ان تمام دینی ،فکری اور علمی اتہامات کا ذکر ان کے علمبرداروں کے حوالہ سے کیا ہے۔ان میں خاص نضر بن حارث بن کلدہ عبدری کا ذکر کیا ہے کہ وہ رسول اکرمؐ کی تلاوت مجلس قرآن میں رخنہ اندازی کرتا تھا۔آپؐ قریش اور دوسرے لوگوں کو قرآن کریم سناتے تو وہ رستم السندید،اسفندیار اور ملوک فارس کے بارے میں قصے سناتا۔ رسول اکرمؐ کے قرآنی بیانات کو اساطیر الاولین قرار دیتا اور دوسروں سے ماخوذ بتاتا اور اپنی حدیث کو حدیث نبوی سے بہتر بھی کہتا۔قرآن مجید کی مختلف سورتوں کی آیات کریمہ میں ان تمام الزامات کی تردید کی گئی ہے۔(فرقان:۵-۶؛قلم:۱۵؛جاثیہ:۷-۸)مجالس نبوی میں بعض اکابر قریش کا اور خاص کر نضر بن حارث عبدری کے اعتراضات کا جواب قرآنی آیات کے حوالے سے آپؐ نے دیا تھا۔ایسی فکری اور دینی بحثوں کا حوالہ ابن اسحاق نے بعض اور اکابر کے حوالے سے کیا ہے جیسے عبداللہ بن الزبعری سہمی جس نے سورۂ انبیاء ۱۰۱-۱۰۲ کی آیات سن کر حضرات عزیر وعیسیٰ علیہما السلام کی عبادت یہود ونصاریٰ کے مسئلہ پر ولید بن مغیرہ کے مشورہ سے بحث کی جبکہ نضر بن حارث عبدری میدان چھوڑ گیا تھا۔قریشی اکابر عبداللہ بن زبعری کے استدلال سے یہ سمجھ لیا کہ انہوں نے پالا مار لیا۔حضرت عیسیٰؑ کے ذکر قرآنی پر قریش کی حیرانی، پریشانی اور کج بحثی کا سد باب سورۂ زخرف:۵۷-۶۱ میں کیا گیا ہے۔(۳۷)

عظیم ترین اورمحترم ترین شیوخ قریش میں عتبہ بن ربیعہ عبشمی کا شمار بوجوہ ہوتا ہے۔وہ بلاشبہ سید قریش تھے۔قریشی مجالس میں ان کو سب سے بلند مقام حاصل تھا اور دوسرے اکابر بھی

ان کو "پدر قبیلہ" کا درجہ دیتے تھے۔ان کی صفات حمیدہ ہی ایسی تھیں۔ان کا مجالس نبوی سے برابر واسطہ رہا اور ایک موقع پر وہ جب مصالحانہ تجویز پیش کرنے گئے تھے تو زبانِ رسالت مآبؐ سے قرآن مجید کی آیات سن کر اتنے متاثر ہوئے کہ چہرہ کے خدوخال بدل گئے اور اس کا ادراک اکابر قریش نے بھی کرلیا اور اسی کے بعد انہوں نے اکابر قریش کو رسول اکرمؐ کے حال پر ان کو چھوڑ دینے کا مشورہ دیا تھا جس کا اوپر ذکر آچکا۔(۳۸)

مکی سورتوں میں اللہ تعالیٰ نے قریش وعرب کے ساتھ یہود و نصاریٰ کے غلط افکار و عقائد اور اعمال کی تردید کی ہے۔وہ عام تردید بھی ہے کہ پوری پوری قوم کا حوالہ دیا گیا ہے اور خاص استدلال بھی ہے کہ متعدد اکابر و شیوخ کے حوالے آیا ہے۔ایسے اکابر قریش کئی تھے۔ابن اسحاق/ابن ہشام کے مطابق ان میں خاص تھے: اخنس بن شریق ثقفی حلیف بنوزہرہ؛ ولید بن مغیرہ؛ ابی خلف، ابوجہل، امیہ بن خلف، عقبہ بن ابی معیط وغیرہ۔مآخذ سیرت وحدیث میں ایسی تمام فصول ومباحث میں دوسرے اکابر قریش کا بھی ذکر ملتا ہے۔اس کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ وہ تمام عوام وخواص عرب وقریش کے افکار و اعمال کی تردید ہے۔(۳۹)

پوری سورۂ کہف کا سبب نزول عام طور پر اکابر قریش کے سوالات کو قرار دیا جاتا ہے جو وہ یثرب کے احبار سے پوچھ کر آئے تھے تاکہ رسول اکرمؐ کو خاموش ولاجواب کردیں۔قرآن مجید کی وحی میں ان کے جوابات سے وہ خود لاجواب ہوگئے۔مآخذ نے ان میں جن اکابر قریش کے اجماعی فیصلہ کا ذکر کیا ہے وہ تھے: عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، ابوسفیان بن حرب، نضر بن حارث، ابوالبختری بن ہشام، اسود بن مطلب، زمعہ بن اسود، ولید بن مغیرہ، ابوجہل بن ہشام، عبداللہ بن امیہ، عاص بن وائل، امیہ بن خلف اور اس کا برادر ابی اور فرزندان حجاج منبہ ونبیہ وغیرہ۔ان کے بحث ومباحثہ اور فیصلہ کے مطابق نضر بن حارث اور عقبہ بن ابی معیط یثرب گئے تھے اور احبار یہود سے سوالات پوچھ کر آئے تھے۔یہ خاصی لمبی بحث مآخذ میں خاص کر ابن اسحاق میں ملتی ہے اور اکابر کا علمی رویہ بتاتی ہے۔(۴۰)

علمی ودینی استدلال اور فکری کج بحثی سے عاجز آکر اکابر قریش نے اشتراک دین کا ایک نسخہ تجویز کیا کہ مسلمان اور ہم ایک دوسرے کے معبودوں کی عبادت کیا کریں اور وحدت

ادیان کے ذریعہ دینی وفکری اختلافات دور کرلیں ۔ یہ تجویز مصالحانہ رسول اکرمؐ کے طواف کعبہ کرنے کے دوران ایک خاص مجلس میں پیش کی گئی اور اس کے محرک اکابر قریش تھے : اسود بن مطلب، ولید بن مغیرہ، امیہ بن خلف، عاص بن وائل، ابوجہل مخزومی نے شجرہ زقوم کے ذکر پر اعتراض کیا تھا۔قرآن مجید نے بالترتیب سورہ کافرون اور سورہ صٰفٰت :۴۳ میں ان کا جواب دیا کہ مسلمان تو صرف عبادت الٰہی کے قائل اور اسی پر عامل ہیں ۔(۴۱)

مجالس نبوی کا تیرہ سالہ مکی دور مسلسل دعوت نبوی کا زمانہ تھا اور رسول اکرمؐ ہر روز ان میں اکابر قریش کو دعوت دیتے تھے، ان کو قرآن کریم کی آیات سناتے تھے، ان کے استدلالات کے جواب دیتے تھے اور ہر طرح کی جاں کاہی کرتے تھے۔اس مستقل و مسلسل معمول نبوی نے اکابر قریش اور قوم عرب پر کئی اثرات مرتب کیے۔مسلسل دعوت کے خلوص نے عوام وخواص کے دل جیت لیے اور ان کو قرآن مجید کی زبان و بیان کا شیدا بنادیا کہ ابوجہل جیسے سنگدل و منکر چھپ چھپ کر اسے سنتے ۔ اکابر قریش کے مختلف طبقات تنہا سنتے تو حیران و ششدر اور خاموش ہوجاتے اور کلام الٰہی کی حقانیت کا خیال لے کر اٹھتے ۔سب سے دلچسپ اور معنی خیز اثر یہ ہوتا کہ مجالس نبوی میں قرآن مجید کی آیات کریمہ اور دعوت نبوی سن کر وہ باہم لڑ جاتے تھے۔موخرالذکر تاثیر کا ایک دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ عقبہ بن ابی معیط اموی نے مجلس رسول اکرمؐ میں آپؐ سے کلام الٰہی و کلام نبویؐ سنا اور خاموش رہا۔اس کے جانی دوست ابی بن خلف جمحی کو واقعہ کی خبر ملی تو وہ عقبہ اموی پر چڑھ دوڑا کہ تم نے محمدؐ کی مجلس میں بیٹھ کر سنا لہٰذا اب تم سے کبھی کلام نہیں کروں گا اور تمہاری صورت بھی نہیں دیکھوں گا۔ عقبہ اموی نے دوست کی شرط مان لی کہ اگلی بار وہ مجلس میں بیٹھ گیا تو چہرہ انور پر تھوک دے گا اور ظالم نے ایسا ہی کیا۔اسی طرح ابی بن خلف جمحی نے رسول اکرمؐ کو دعوت طعام میں بلالیا تو عقبہ اموی نے اپنے دوست پر سخت نکیر کی ۔ اکابر قریش کی روش رسول اکرمؐ کے باب میں گومگو کی تھی، سنے بغیر رہا نہیں جاتا تھا، ایک سنتا تو دوسرا اسے سرزنش کرتا، چھپ چھپ کر کئی کئی سنتے تو بعد میں ملاقات پر پچھتاتے اور ملامت باہمی کرتے مگر پھر سنتے ۔(۴۲)

اسلام، قرآن اور رسول اکرمؐ کے بارے میں قریشی اکابر کے قومی، فکری، علمی، دینی اور استدلالی رویہ کا ایک مظہر بہت معنی خیز ہے۔وہ عظیم ترین شیخ قریش ولید بن مغیرہ مخزومی کے

تحیر کے عنوان سے ابن اسحاق نے بجا طور سے بیان کیا ہے۔ خود کبیر قریش نے تجویز رکھی کہ موسم حج آنے والا ہے اور وفود عرب کے سامنے رسول اکرمؐ اپنا کلام و دعوت رکھیں گے لہٰذا ان کے بارے میں ایک متفقہ قومی موقف تیار کرلیا جائے۔ قوم نے متعدد الزامات و اتہامات باری باری سے شیخ قریش کو سنائے اور اس نے سب کی تردید کی: آپؐ نہ کاہن ہیں، نہ مجنون ہیں، نہ شاعر ہیں، نہ ساحر ہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ کاہن کیا ہوتا ہے، مجنون کی کیا صفات ہیں، شعر کیا ہے اور سحر و ساحری کیا ہے۔ اس کا اعتراف حق تھا کہ بلاشبہ ان کے کلام میں حلاوت ہے، اس کی اصل شجر نفیل ہے اور اس کی شاخ چیدہ ثمر ہے: "واللّٰہ ان لقولہ لحلاوۃ ، وان أصلہ لعذق، وان فرعہ لجناۃ" ۔ یہی کلام الٰہی کی تاثیر تھی کہ وہ حیران و مبہوت ہوجاتے اور دل میں اسے حق سمجھتے۔ (۴۳)

خاتمۂ بحث: اکابر قریش اور قوم قریش کی مخالفت اسلام اور عداوت نبویؐ پر مآخذ سیرت میں گوناگوں روایات ہیں۔ بسا اوقات وہ ایک عمومی انداز اختیار کرتی ہیں کہ قریش نے قومی اور قبائلی سطح پر عداوت و مخالفت کا رویہ اپنایا۔ تعمیم کا یہ مقبول عام رویہ اکابر قریش کے بارے میں بھی ملتا ہے کہ سب کے سب موذی، مذاق اڑانے والے اور مخالف ہی تھے۔ جدید سیرت نگاروں کو ایسی تعمیم بہت بھاتی ہے اور قومی مخالفت اور قبائلی عداوت کا صرف ایک طرفہ رخ پیش کرتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ رسول اکرمؐ کی مخالفت اور اسلام سے ان کی دشمنی کے علمبردار بھی تھے جن کو شدت پسند طبقہ کہا جاسکتا ہے۔ دوسرے نیم گرم قسم کے اکابر تھے کہ دینی اختلاف تو کرتے تھے اور اسلام کی سماجی تاثیر پر شکوہ کناں بھی تھے مگر تشدد کے خلاف تھے۔ علامہ شبلی جیسے بعض نادر و نایاب محققین سیرت نے کچھ اکابر قریش کے "شریف النفس" ہونے کا سراغ لگایا ہے مگر وہ بھی معتدل اکابر اور ان سے زیادہ منصف مزاج، نرم رو اور حمایت کرنے والوں کا پتہ نہیں لگا سکے اور نہ تجزیہ ہی کرسکے۔ چند روایات کو چن کر یا مولفین سیرت کے بعض بیانات کو بنیاد بنا کر قریشی مخالفت اور اکابر قریش کے عناد کا عمومی باب لکھ دیا۔ (۴۴)

دوسرے انسانی سماجوں کی طرح قریش مکہ کے عرب سماج میں بھی افراد و طبقات کے رنگارنگ سماجی رویے تھے۔ سماجیات کے اصول اور انسانی فطرت کی ساخت اور وقت کے احوال و ظروف

کے تناظر میں مطالعہ کرنے سے حقیقت کھلتی ہے(۴۵)۔بلاشبہ دینی اختلاف اتنا وسیع الجہات نہیں تھا جتنا سمجھا یا سمجھایا جاتا ہے کیونکہ اسلام کو اصل دین ابراہیمی بنا کر پیش کیا گیا۔قوم قریش اوران کے اکابر بلکہ تمام عرب قبائل کو دعویٰ تھا کہ وہ دین ابراہیمی کے پیرو ہیں۔اس قدر مشترک نے دینی اختلاف کو زیادہ پھیلنے نہیں دیا۔دین ابراہیمی کے عقائد واقدار،اعمال واشغال،ارکان وعبادات اورشعائر کی ہم آہنگی نے بھی کارگذاری کی تھی(۴۶)۔دینی اعتبار سے ان اکابر قریش کواوران کی جاہلی قوم کو مروجہ دین و مذہب پر قرآنی نقد وتبصرہ نے زیادہ برافروختہ کیا تھا۔جاہلی مراسم اور بدعات وخرافات خاص کرشرک کے تمام مظاہر پر قرآن ورسولؐ کی نکتہ چینی ان کوگراں گذرتی تھی کہ شرک ان کی نفسیات میں بیٹھ گیا تھا اور وہ اللہ تعالیٰ کی توحیداور خالص عبادت کرنے سے صنم پرستی کی وجہ سے گریزاں تھے۔اسی ہٹ دھرمی کی وجہ سے وہ دوسرے عقائد اسلامی-نبوت ورسالت، آخرت ومعاد وغیرہ کے صحیح مفہوم سے بے بہرہ ہو گئے تھے۔قرآن مجید کی بہت سی آیات کریمہ میں مکی اکابر اور قریشی عوام اور تمام دوسرے عربوں اورانسانوں کو صحیح آگاہی بخشی گئی ہے۔(۴۷)

رسول اکرمؐ کی دعوت میں اول روز سے صحیح دین ابراہیمی کی طرف لوٹ آنے پر زور دیا گیا تھا۔اس حقیقت کے وہ منکر بھی نہ تھے لیکن رسول اکرمؐ کے منصب رسالت پر فائز ہونے سے وہ اپنے سماجی رویے کے سبب سرگرداں تھے۔ان کے سماجی فکر وخیال میں رسول آخرالزماںؐ کو کسی صاحب منصب وسیادت کا ہونا ضروری تھا۔ان کا تصور عظمت دنیاوی فکر پر مبنی تھا۔اکابر قوم کا بڑا طبقہ یہ بھی خوب سمجھتا تھا کہ حضرت محمدؐ کی رسالت ونبوت تسلیم کر لینے کے بعد سیادت ان کے ہاتھ سے نکل جائے گی۔کچھ خاندانی اور قبائلی مسابقت نے بھی گل کھلایا تھا اورسب سے زیادہ ان کی قوم کی دینی تقسیم نے ان کے سماجی نظام کو تلپٹ کر دیا تھا۔مآخذ میں بار بار مختلف اکابر و شیوخ کا یہ شکوہ نقل کیا جاتا ہے کہ اسلام اور رسول اکرمؐ نے ان کے خاندانوں میں پھوٹ ڈال دی ہے۔سادات وشیوخ کو اپنے فرزندوں،دختروں،نوجوانوں اورعزیزوں کی اسلام پسندی اور بزرگی،عظمت اورسیادت سے بغاوت لگتی تھی۔(۴۸)

تمام اسباب اختلاف اور وجوہ عناد نے قریشی اکابر کے کئی طبقات بنادیے تھے جیسا کہ مآخذ میں ان کا ذکر ملتا ہے۔ان میں سب سے نرم رو وہ جاہل وسفیہ قوم تھے جو دین سے اختلاف

اوررسول اکرمؐ کی مخالفت تو کرتے تھے مگر ظلم وستم سے بچتے تھے۔ان کی زبانیں بھی حدودشرافت میں رہتیں اور ہاتھ پیراوراعضاء وجوارح قابو میں رہتے کہ وہ اپنوں کے خلاف کچھ کہتے اور کرتے نہ تھے۔دوسرے وہ اکابر قریش تھے جن کو مآخذ بالعموم مذاق اڑانے والے اورطنزوتعریض کرنے والے (مستہزئین) تھے اور خاصے تھے۔تیسرا طبقہ اکابر تشدد پسند تھا اوران میں بھی دوطرح کے لوگ تھے: ایک معمولی زدوکوب اور جسمانی تکلیف دہی تک محدود رہتا تھا اور دوسرا سخت ایذا دینے کا قائل تھا۔اسی طبقۂ متشددین نے غلام وموالی کی زندگی اجیرن کردی تھی کہ سخت ایذائیں دیتے تھے۔وہ خودتو موذی تھے ہی سفیہانِ قوم اورلڑکوں بالوں اوراوباشوں کومسلمانوں کی ایذادہی اورسرعام رسوائی پرلگادیتے تھے۔(۴۹)

انتہاپسندوں نے عام مخالفت اوروسیع ترعداوت کا ماحول پیدا کردیا جس میں شریف النفس درکنار ہوگئے (۵۰)۔مگران میں سے بعض اکابراپنے بلندتر قدوقامت اورسماجی رسوخ اورقبائلی عظمت کے سبب حمایت مسلم کا کام بھی کرجاتے تھے۔عاص بن وائل سہمی ان میں سے ایک تھے جنہوں نے حضرت عمرؓ کے قبول اسلام پراکابرقریش سے کہا تھا کہ ایک شخص کوایک دین پسند آیا، اس نے اسے اختیار کرلیا اور یہ ہر شخص کا حق ہے لہٰذا ان کو کیوں زدوکوب کرتے ہواوران سے جھگڑا کیوں مول لیتے ہو؟ پھرازخوداپنی جوارو پناہ میں لے لیا۔تشدد پسندوں اورظالموں کو یہ شریفانہ رویہ کبھی نہیں بھایا اوروہ مسلمانوں کے اوپرظلم کرتے رہے۔قریش مکہ کا سماجی تحفظ کا نظام عام تعذیب کی راہ میں سب سے بڑا روڑا تھا کہ کسی دوسرے خاندان کے مسلم پردست درازی خطرناک تھی۔ابوجہل مخزومی کورسول اکرمؐ کی ایذادہی پرحضرت حمزہ بن عبدالمطلب ہاشمی سے اسی سبب مار کھانی اور برداشت کرنی پڑی تھی۔بنو ہاشم و بنومطلب نے متحدہ طور سے ابوطالب بن عبدالمطلب ہاشمی کی بے لچک اورواضح حمایت نبوی کی وجہ سے ساتھ دیا تھا۔صلہ رحمی،قرابت و رشتہ داری،خون اور دودھ کی یگانگت اورایسے دوسرے سماجی رشتوں نے ان کواپنوں پرظلم سے روکا بھی تھا۔(۵۱)

جوار کی صحت مندروایت بلاشک وشبہ ظلم وستم اورتعذیب کی حدودکوقائم کرنے میں سب سے زیادہ کارگر رہی تھی۔اکابرقریش اورسادات قوم اپنے اپنے مسلمانوں کی حفاظت وصحت

کے تو قومی روایات کی وجہ سے پابند تھے کہ وہ ان کی عزت و وقار کا معاملہ تھا۔ کوئی غیر ان کے اپنے پر دست درازی کر جائے ان کے لیے نا قابل برداشت تھا لیکن جب انتہا پسندوں نے قبائلی و خاندانی تحفظ کے نظام میں سیندھ لگائی اور خود اپنوں پر اپنوں کے ستانے کی راہ دکھائی تو تعذیب مسلم کی شاہراہ کھل گئی۔ اسی خاندانی تعذیب نے عوامی مخالفت کا ماحول پیدا کیا اور بہت سے مسلمانوں کو اپنے لوگوں کے دست برد سے بچنے کے لیے ہجرت کرنی پڑی (۵۲)۔ اس سے زیادہ طرفہ تماشا تھا کہ نفسیات اکابر کی پیچیدگی یا سماجی اصولوں کی جبر دستی کہ وہ غیروں کو جوار میں لینے لگے۔ جوار کی طلب پر اس سے انکار کرنا عرب مروت اور قریشی شجاعت کے خلاف تھا۔ وہ اپنے وقار و عظمت کو کسی طرح داؤں پر نہیں لگا سکتے تھے۔ مہاجرین حبشہ میں سے متعدد مسلمانوں کو مختلف خاندانی اکابر کی جوار فراہمی اسی سماجی ریت اور فطری جبلت تحفظ کی ایک علامت تھی۔ ابوطالب ہاشمی کی حمایت و نصرت نبوی ان کی شرافت سے زیادہ ان کے خاندانی اور سماجی اصول کی بنا پر تھی اور ان کے بعد بنونوفل کے شیخ مطعم بن عدی کی رسول اکرمؐ کو طلب پر جوار میں لینے کی واقعیت میں اسی قریشی و عرب وقار و افتخار کی کارفرمائی تھی۔ تمام جوار دینے والے اکابر قریش کی نفسیات کا مطالعہ کرنے سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ اپنے مسلمہ اصول سماجی سے روگردانی نہیں کر سکتے تھے۔ اس کا سب سے شاندار و نتیجہ خیز پہلو یہ تھا کہ ایک کبیر قوم کی جوار و حمایت کو انتہا پسند اور جانی دشمنان نبوی بھی تسلیم کرتے تھے۔ جوار نبوی کا معاملہ ہو یا ابن الدغنہ کی جوار ابی بکر کا یا کسی اور کی جوار کا تمام اکابر بیک زبان اسے صلہ رحمی اور قرابت داری کی رعایت کہتے تھے۔ (۹۵۳)

صلہ رحمی، قرابت داری، خاندانی محبت اور ایسی ہی سماجی جہات نے مسلمانوں کی اعانت و امداد پر بھی انہیں ابھارا تھا۔ سماجی مقاطعہ کے سخت ترین زمانے میں جن اکابر قوم نے محصور مسلمانوں اور ان کے حامی ہاشمیوں اور مطلبیوں کی دستگیری اور مدد کی تھی اسے اعتدال پسندوں نے صلہ رحمی کا تقاضا قرار دیا تھا۔ اور یہ صرف ایک واقعہ نہ تھا بلکہ تسلسل کے ساتھ ان واقعات کا سلسلہ تھا۔ مہاجرین حبشہ کے ہجرت کرنے کے بعد دیار غیر میں ان کی اخلاقی اور مالی امداد و اعانت میں صلح پسند اور معتدل اکابر پیش پیش تھے۔ دوستی اور قربت کے تعلقات نے امیہ بن خلف جمحی جیسے جانی دشمنوں کو اپنے مسلم دوستوں اور عزیزوں سے حسن سلوک پر مجبور کیا تھا۔ یہ

بھی حقیقت یادرکھنے کی ہے کہ بنو ہاشم اور بنو مطلب کی سماجی ناکہ بندی سے اکثریت اکابر متفق نہ تھی اور نہ ہی عوام کے طبقات ۔ان کی زباں بندی اور قوت اظہار پر انتہا پسندوں کی جبریت نے تالہ لگادیا تھا کہ وہ ان کے اقدام کے خلاف کچھ نہ کر سکے ۔عداوت و مخالفت کی عام فضا میں جب اسے قومی معاملہ و مفاد بنا دیا جائے تو حق پرست اور انصاف پسند خاموشی پر مجبور ہو جاتے ہیں لیکن ان ہی منصف مزاجوں کی قرابت داری اور صلہ رحمی کے جذبات نے بالآخر سماجی مقاطعہ جیسے ظالمانہ نظام دار و گیر کو بکھیر دیا تھا۔(۵۴)

حامی و ہم نوا اور موافق اکابر کے طبقہ کی نمائندگی عتبہ بن ربیعہ عبشمی جیسے صلح پسند، دوربیں اور قومی وقار کے پیکر کرتے تھے ۔یہ طبقۂ اکابر بہت چھوٹا تھا مگر وہ خاصا فعال بھی رہا تھا۔اس نے رسول اکرمؐ کو ان کے حال پر چھوڑ دینے کا رویہ اپنانے کا اور اسی غیر جانب دارانہ روش کو دوسروں کو اختیار کرنے کا مشورہ دیا تھا۔اکابر قریش سے ان کی مصلحانہ تجویز بہت حکمت آمیز بھی تھی ۔محمدؐ کو ان کے حال پر عربوں کے لیے چھوڑ دو، اگر عرب غالب آ گئے اور محمدی پیغام کو سمیٹ دیا تو تمہارا مقصود ظلم و ستم تمہیں مل جائے گا۔اگر محمدؐ عرب اور عالم پر غالب آ گئے تو ان کی سیادت تمہاری سیادت ہوگئی اور ان کا اقتدار (ملک) تمہارا اقتدار ہوگا۔حضرت محمد بن عبداللہ ہاشمی کی نبوت و رسالت اور اس کے برپا کردہ نظام کی ایسی دوربینی صرف ایسے ہی اکابر کے خیال میں آ سکتی تھی ۔(۵۵)

ان کا یہ دوربیں و مستقبل شناس رویہ و حکمت دراصل رسول اکرمؐ کے مسلسل اعلانات و اظہارات کا پرتو تھا۔دعوت اسلامی کے اول روز سے آپؐ اکابر بنی عبد مناف اور شیوخ قریش اور عوام عرب سے کہتے آ رہے تھے کہ میں تمہارے پاس ایسا کلمہ لایا ہوں جسے اگر تم قبول کرو گے تو عرب و عجم تمہارے اطاعت گذار بنیں گے اور تم سب پر حکومت و فرماں روائی کرو گے ۔حضرت ورقہ بن نوفل اسدیؓ جیسے تاریخ انبیاء کے ماہر اور نبوت و رسالت کی سربلندی کے قائل بھی غلبۂ محمدی کی پیشگوئی کرتے رہتے تھے۔خود انتہا پسند اکابر قریش بھی اسلام اور پیغمبر اسلامی کے عالمی و آفاقی اقتدار و سیادت کا منظر نامہ اپنی بصیرت سے دیکھ رہے تھے لیکن اپنی ذاتی سیادت اور شخصی مشیخت کے ہاتھ سے جانے پر مضطرب تھے اور اسی ذاتی و شخصی اقتدار کی خاطر عداوت پر کمر باندھ لی تھی ۔قریشی اکابر کے علاوہ دوسرے عرب قبائل کے سادات و اکابر بھی اسی عالمی سیادت کو دیکھ رہے

تھے لیکن فطرت سے مجبور تھے۔(۵۶)

تیرہ سالہ مکی دور نبوی میں دعوت اسلامی پر قریشی اکابر کا ردعمل ہر لحاظ سے بڑا عجیب و غریب رہا تھا۔ وہ بڑے مخمصے میں پھنسے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ رسول اکرمؐ کو مکہ میں قیام پذیر رہنے دیں یا شہر بدر کردیں یا موت کے گھاٹ اتار دیں۔ یہ ان کی مکر بھری سیاست کا بیان ہے جو سورۂ انفال: ۳۰ میں آیا ہے: '' وَاِذْ یَمْکُرُ بِکَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لِیُثْبِتُوْکَ اَوْ یَقْتُلُوْکَ اَوْ یُخْرِجُوْکَ الخ'' وہ اپنی چالیں چل رہے تھے اور اللہ تعالیٰ ان سے بہتر چالیں چل رہا تھا۔ مکی سورتوں میں رسول اکرمؐ اور دعوت اسلامی کے متعلق اور بھی مضامین ہیں جو ان کے ردعمل کو ظاہر کرتے ہیں اور وہ ان سے واقف تھے۔ مختلف آیات میں نصرت الٰہی کا وعدہ اور مسلم غلبہ و فتح کا ذکر مکی بھی ان کے سامنے تھا خاص کر سورہ روم: ۱-۷ کا وعدہ الٰہی۔ اس پر ان کے بعض طالع آزماؤں نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ہار جیت کی شرط لگائی تھی اور آٹھ سال میں وہ ہار بھی گئے تھے (۵۸)۔ ان کے سامنے سورہ اسرا: ۷۶ کا حتمی اعلان بھی تھا کہ وہ آپؐ کو شہر بدر کر کے زیادہ دنوں تک باقی نہ رہ سکیں گے۔ ''وَاِنْ کَادُوْا لَیَسْتَفِزُّوْنَکَ مِنَ الْاَرْضِ لِیُخْرِجُوْکَ مِنْھَا وَاِذًا لَّا یَلْبَثُوْنَ خِلٰفَکَ اِلَّا قَلِیْلًا'' کیونکہ یہی سنت الٰہی تھی (۵۹)۔ ان کے صاحبان بصیرت سورہ قصص: ۸۵ کے وعدہ الٰہی کے معانی بھی سمجھتے تھے کہ جس ذات بے ہمتا نے آپ پر قرآن فرض کیا ہے وہ آپ کو اپنے وطن (معاد) کی طرف پھر واپس لائے گا: ''اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّکَ اِلٰی مَعَادٍ'' الخ۔(۶۰)

قرآن مجید کی ان آیات کریمہ کے علاوہ ان کے سامنے وہ تمام الٰہی وعدے بھی تھے جن میں آپؐ کے تمکن (غلبہ) کا ذکر ہے (۶۱)۔ سادہ لوح عوام کو بھلے ہی خبر نہ ہو اور خوش فہموں کو خواہ حقیقت کا ادراک نہ رہا ہو لیکن دوراندیش اکابر ان سے آگاہ تھے۔ روایات سیرت و حدیث سے اور واقعات و حقائق کے بلندی کی طرف اقبال سے وہ اقبال نبوی اور غلبۂ مسلم کو دیکھ رہے تھے۔ کئی مواقع پر اکابر قریش اور ان جہاں دیدہ سرخیلوں نے اپنے لوگوں کو سمجھایا تھا کہ اب تو شاہ روم بھی محمدؐ سے خوف زدہ ہے (۶۲)۔ حضرت عروہ بن مسعود ثقفی نے صلح حدیبیہ سے قبل اور حضرت ابوسفیان بن حرب اموی نے معاہدہ حدیبیہ کے بعد اس کا اظہار کیا تھا۔ تاریخی

واقعات ان کے سامنے تھے کہ مکی دور کی سیاست و زمانہ میں رسول اکرمؐ کی دعوت اسلامی وسیع سے وسیع تر ہوتی جارہی ہے۔قریش کے تمام خاندانوں میں اس نے ایسے قدم جما لیے ہیں کہ ان کا جاہلی اتحاد پارہ پارہ اورقومی یکجہتی شکستہ ہوچکی ہے۔پانچ سال کے عرصے میں اسلامی دعوت نے ملک عرب کے اندرون میں اور دور دراز کے علاقوں میں اپنے علمبردار و جاں نثار پیدا کر لیے ہیں اوراس سے زیادہ وہ عرب کے جزیرہ نما سے باہر ملک حبشہ میں بھی پھیل چکی ہے اوراس کے شاہ وحکمراں کو رام کرچکی ہے۔آخرآخر میں یثرب کے دونوں عرب قبیلوں اوس وخزرج کے اکابر وعوام کی تمامترقوت دعوت اسلامی کی پشت پر کھڑی ہے۔وہ بخوبی سمجھتے تھے کہ مکہ مکرمہ سے رسول اکرمؐ کا یثرب چلا جانا ان کے اقتدار ووقار دونوں کے لیے سخت خطرناک ثابت ہوگا،لہٰذا وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ اب ہجرت نبوی کو کسی طرح روکا جائے اور مکہ وقریش کا مدمقابل یثرب کو کسی طرح نہ بننے دیا جائے۔ان کے انتہا پسندوں نے بہرحال صلح جو اور معتدل بلکہ حامی طبقہ اکابر کے مشورہ ورائے کے خلاف آپ کو قتل کرنے کا فیصلہ ہی کرلیا۔تدبیر نبوی اور تقدیر الٰہی نے ان کی بساط مکروفریب ان ہی کے منھ پر دے ماری اور رسول اکرمؐ اور صحابہ مرکز اسلام میں پہنچ گئے (۶۳)۔ہجرت صحابہ اور ہجرت رسولؐ کے واقعات میں مکار اور متشدد اکابر قریش کی چالیں ملتی ہیں وہیں ان کے معتدل اکابر کی محبتیں بھی ملتی ہیں۔انتہا پسندوں کا واحد مقصود ہجرت کا روکنا اور صاحب ہجرت کو قتل کرنا تھا تاکہ ان کے سماجی انتشار اور سیاسی اقتدار کا خطرہ مٹا دیا جائے۔صلح کل اور معتدل اکابر قریش ان سے اختلاف رکھتے تھے اور چاہتے تھے کہ محمدؐ اور ان کے اصحاب کو اپنی زندگی جینے کا موقع دیا جائے،صلہ رحمی،قرابت داری اور خاندانی تعلق خاطر کے مارے اکابر ہم نوا بھی تھے اور مددگار۔مطعم بن عدی نوفلی اوران کے فرزندوں نے حفاظت کا ذمہ لیا تھا۔ایسے دوسرے اکابر شریف النفس بھی تھے اوراپنے عزیزوں کے مددگار بھی تھے۔یہ سارا انتظام عصمت وحفاظت الٰہی کے تکوینی قانون کا ظاہر تھا اور رسول اکرمؐ نے ان شریف النفس لوگوں کے احسان کو یاد رکھا تھا اور صحابہ کرام نے بھی احسان شناسی کا ثبوت دیا تھا۔(۶۴)

حواشی

(۳۱) بلاذری ۱/۵۲۸-۵۲۹ ومابعد؛مفصل بحث کے لیے مقالہ خاکسار''عہد نبوی میں سماجی تحفظ کا نظام،

تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، اکتوبر- دسمبر ۲۰۰۲ء۔ (۳۲) مذکورہ بالا مآخذ: ابن اسحاق / ابن ہشام بحوالہ سہیلی، الروض الانف ۱۵۸/۲: ابوطالب نے اپنے بھانجے ابوسلمہ مخزومی کو جوار دی تھی جس پر متشدد اکابر نے شکوہ کیا۔ ابولہب جیسے دشمن نبیؐ کو غیرت آ گئی اور اس نے ان کو دھمکایا کہ بس بہت ہو گیا۔ تم سب اس شیخ پر بہت زیادتی کرتے رہے، اب باز آ جاؤ ورنہ میں اپنے بھائی کا تمام معاملات میں ساتھ دوں گا۔ یہ پورا بیان نقل کے قابل ہے: "...... فقام ابو لهب فقال : يا معشر قريش ! والله لقد اكثرتم على هذا الشيخ ، ما تزالون تتواثبون عليه فى جواره من بين قومه والله لتنتهن عنه او لنقومن معه فى كل ما قام فيه حتى يبلغ ما اراد......" اور قریشی اکابر نے سپر ڈال دی تھی کہ وہ ابولہب کی حمایت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ (۳۳) ابن اسحاق ۳/۲-۵؛ ابن سعد ۱۰۰/۱-۱۰۱؛ بلاذری ۲۴۲/۱۵ و مابعد۔ (۳۴) ابن اسحاق / ابن ہشام ۱۸/۲-۲۰: ابوطالب کا ایک قصیدہ ان اکابر قریش کی مدح میں منقول ہے۔ ابن سعد مذکورہ بالا نے اصل واقعہ واقدی کی روایت پر بیان کیا ہے جو ابن اسحاق کی روایت کا اختصار لگتا ہے۔ بلاذری ۲۴۵/۱- ۲۴۸ نے بھی واقدی کی روایت کو بنیاد بنایا ہے اور کلبی کی روایت سے اس میں اضافہ کیا ہے "...... قال زمعة بن الاسود : ...... ما رضينا كتابتها حيث كتبت ، قال ابو البخترى : صدق زمعه ، لا نرضى ما كتب فيها ولا نقربه . قال المطعم بن عدى : صدقتما و كذب من قال غير ذلك ، نبرأ الى الله منها ومما كتب فيها ، قال هشام بن عمرو نحوا من ذلك ......" ابن اسحاق نے ایک دلچسپ بات یہ کہی ہے کہ ان اکابر قریش کی تقریروں کے وقت ابوطالب مسجد میں موجود تھے۔ (۳۵) ابن اسحاق ۱۶/۲-۲۰؛ ابن سعد ۱۰۰/۱-۱۰۱؛ بلاذری ۲۴۵/۱-۲۴۸؛ سب کی روایات میں پانچ اکابر قریش کے اسماء اور کارنامے مذکور ہیں۔ (۳۶) ابن اسحاق / ابن ہشام ۴/۲-۵، کا بیان ہے کہ صلہ رحمی کرنے والے قریشی رات کی تاریکی میں خفیہ طور سے امداد کرتے، وہ سامان رسد سے لدے ہوئے اونٹ وادی میں ہانک دیتے تھے۔ حضرت حکیم بن حزام اسدی نے اپنے غلام کے کاندھے پر گیہوں کی بوری اپنی پھوپھی حضرت خدیجہؓ کے لیے بھیجی تھی، ابوجہل مخزومی نے ایسا کرنے سے روکا اور تشدد بھی کرنا چاہا لیکن ابوالبختری ہشام بن عاص نے حضرت حکیم کی حمایت کی اور ابوجہل نے جب اس پر بھی روک تھام کی تو اس کو اونٹ کی ہڈی سے مار کر زخمی کر دیا اور پھر خوب خوب اس کی کٹائی کی۔ دو اکابر قریش کی باہمی مار پیٹ اور جھگڑے پر یہ تبصرہ بہت دلچسپ ہے کہ حضرت حمزہؓ اسے دیکھ رہے تھے اور جھگڑنے والوں کو یہ فکر ستا رہی تھی کہ قریش کو جب یہ خبر ملے گی

تو خاصا انتشار برپا ہوگا لہٰذا وہ اسے جلدی سے ٹال گئے۔(۳۷) ابن اسحاق/ابن ہشام ۲/۷-۹: آیات کریمہ میں:"وقالوا اساطیر الاولین اکتتبھا فھی تملی علیہ......" فرقان:۵؛"واذا تتلیٰ علیہ آیٰتنا قال اساطیر الاولین" ؛قلم:۱۵"...... یسمع آیٰت اللہ تتلی علیہ ثم یصر مستکبرا کأن لم یسمعھا ......"جاثیہ:۷-۸؛ "انکم وماتعبدون من دون اللہ حصن جھنم انتم لھا واردون" الخ انبیاء: ۹۸-۱۰۰؛ "ولما ضرب ابن مریم مثلاً اذا قومک منہ یصدون"،زخرف:۵۷؛ "ان ھو الا عبد انعمنا علیہ وجعلنٰہ مثلا لبنی اسرائیل......" زخرف:۵۹-۶۱۔(۳۸) ابن اسحاق/ابن ہشام ۱/۱۸۵-۱۸۶۔(۳۹) ابن اسحاق/ابن ہشام ۲/۹-۱۰ ومابعد۔(۴۰) ابن اسحاق/ابن ہشام ۱/۱۸۶-۱۹۹: امام سیرت اس فصل میں امام و مفسر قرآن نظر آتے ہیں اور ان کی تفسیر و تشریح بہت عظیم جہات رکھتی ہے اور اس پر خاص کر سیرت ابن اسحاق/ابن ہشام میں مذکور آیات قرآنی کی تفسیر و تاویل ایک عظیم تحقیقی مطالعہ بن سکتا ہے۔(۴۱) ابن اسحاق/ابن ہشام ۲/۱۰ ومابعد۔(۴۲) ابن اسحاق/ابن ہشام ۲/۹-۱۰، واقعہ ابی بن خلف جمحی اور عقبہ بن ابی معیط اموی کے لیے مذکورہ بالا ۱/۱۹۹-۲۰۰؛ ابوسفیان بن حرب اموی، اخنس بن شریق ثقفی اور ابوجہل بن ہشام مخزومی کی قرأت نبوی کو تین مسلسل راتوں میں سننے کے لیے۔اس واقعہ میں سب سے اہم یہ نکتہ ہے کہ تینوں اچانک مل گئے تو ایک دوسرے کو ملامت کی اور دوبارہ نہ سننے کا عہد کیا، مگر پھر دوسری اور تیسری راتوں کو سنا پھر ملامت باہمی کی اور یہی معاملہ تیسری رات بھی رہا۔آخر تینوں نے رسول اکرمؐ اور آپ کی دعوت پر بحث کی۔ابوسفیان اموی کا تاثر تھا کہ میں نے جو کچھ سنا اس میں سے کچھ چیزوں کو سمجھا اور ان کی مراد بھی پالی اور بعض چیزوں کو نہ پہچان سکا اور نہ ان کے معنی و مراد سمجھ سکا۔اخنس بن شریق نے ان سے اتفاق کیا۔ابوجہل مخزومی کا جواب اس کی خاندانی نخوت و مسابقت پر مبنی تھا، اس نے رسول اکرمؐ کے دہن مبارک سے کلام الٰہی سننے کے بارے میں ثقفی سوال کے جواب میں کہا کہ ہم نے اور بنوعبدمناف نے شرف میں تنازع و مقابلہ کیا، انہوں نے کھانا کھلایا تو ہم نے بھی کھلایا، انہوں نے سواری فراہم کی تو ہم نے بھی کی انہوں نے عطا و بخشش کی تو ہم نے بھی کی، یہاں تک کہ ہم جب برابر دوڑنے لگے اور مقابلہ کے دو شہسواروں کی مانند ہوگئے تو بنوعبدمناف نے کہا کہ ہم میں ایک نبی ہے جس کے پاس وحی آسمان سے آتی ہے۔اس جیسی چیز ہم کہاں سے لاتے۔لہٰذا ہم ان پر کبھی ایمان نہ لائیں گے اور نہ ان کی تصدیق کریں گے۔(۴۳) ابن اسحاق/ابن ہشام ۱/۲۷۱-۲۷۳ ومابعد؛ قرآن مجید کی متعدد مکی سورتوں میں رسول اکرمؐ کے شاعر، ساحر و سحرزدہ، کاہن اور مجنون

وغیرہ ہونے کی تردید کی گئی ہے اور اکابر وعوام سب کو غور وفکر کی دعوت بھی دی گئی ہے کہ ان کے تمام الزامات غلط ہیں اگر وہ ایماندارانہ تجزیہ سے کام لیں ۔ (۴۴) مآخذ اور ان پر مبنی جدید نگارشات کا حوالہ بحث کے شروع میں آچکا ہے ۔ وہ دراصل ان کی غلوآمیز فطرت کے تقاضے پر مبنی ہے ۔ ان کے بعض غلط رجحانات اور فکری خیالات بھی اس کے ذمہ دار ہیں مثلاً علامہ شبلی کے فکر وخیال میں بنو ہاشم و بنو امیہ کی قبائلی اور خاندانی رقابت کا نظریہ عقیدہ کی طرح پیوست تھا لہٰذا وہ بنوامیہ کی اسلام دشمنی اور ان کے اکابر کی عداوت ہی کا نقشہ کھینچتے ہیں ۔ دوسری طرف وہ بنو ہاشم کی طرفداری میں اتنی دور تک چلے جاتے ہیں کہ واقعات وحقائق کا انکار نہیں کرتے تو چشم پوشی ضرور کرتے ہیں ۔ ملاحظہ ہو: شبلی ۱/۱۶۷......عبدالمطلب کی موت نے بنو ہاشم کے رتبہ امتیاز کو دفعۃً گھٹا دیا اور یہ پہلا دن تھا کہ دنیوی اقتدار کے لحاظ سے بنوامیہ کا خاندان بنو ہاشم پر غالب آ گیا ۔ عبدالمطلب کی مسند ریاست پر اب حرب متمکن ہوا جو امیہ کا نامور فرزند تھا......، نیز ۱/۲۱۴، ۲۱۶: ''آنحضرتؐ کی نبوت کو خاندان بنوامیہ اپنے رقیب کی فتح خیال کرتا تھا ۔ سب سے زیادہ اسی قبیلہ نے مخالفت کی'' ۔ (۴۵) مکی اکابر، اشرافیہ اور عوام وخواص کے مزاج میں سختی تھی ۔ جغرافیائی اسباب کے علاوہ اس کے سیاسی وسماجی اسباب بھی تھے، یہ ایک طویل اور مدلل تحقیق کا موضوع ہے ۔ ان کے اپنے معیار شرافت اور معراج نخوت سے کوئی فروتر رویہ کمزوری پر مبنی نظر آتا تھا ۔ وہ رحمت عالم بلکہ رحمۃ للعالمینؐ کے نرم مزاج اور اس سے نرم تر سرشت کو ان ہی اسباب وخیالات کے سمجھنے سے قاصر تھے ۔ ان کے نزدیک تو ان کے اپنے معتدل اکابر جیسے عروہ بن مسعود ثقفی، عتبہ بن ربیعہ عبشمی اور ابوسفیان بن حرب وغیرہ بھی قومی افتخار وقبائلی صلابت سے عاری یا کم بہرہ تھے اور وہ ان کی صلہ رحمی، عزیز داری اور محبت وشرافت کو قابل نقد ونفرت سمجھتے تھے ۔ عقبہ بن ابی معیط اموی جیسے جانی دشمن اور امیہ بن خلف جمحی جیسے مخالف اسلام کے بعض اوقات شریفانہ برتاؤ سے بھڑک جاتے تھے ۔ ان دونوں سخت ترین دشمنوں کی صرف مجلس نبوی میں سماعت اور گھر میں دعوت طعام بھی ان کو کھل گئی تھی اور وہ سخت جز بز ہوئے تھے ۔ مردان قریش کی مزاجی سختی اور انصار کے مردوں کی نرمی اور نرم مزاجی کا ایک خوبصورت بیان عورتوں سے ان کے برتاؤ کے ضمن میں آتا ہے ۔ ملاحظہ ہو بخاری / فتح الباری ۲۵۰/۵-۲۵۳ وغیرہ ۔ بحث کے لیے کتاب خاکسار عہد نبوی کا تمدن اور رسول اکرمؐ اور خواتین - ایک سماجی مطالعہ، دہلی ۲۰۰۶ء، متعلقہ ابواب ۔ (۴۶) رسول اکرمؐ نے بالکل ابتدائی دور میں ہی اپنے چچا ابوطالب ہاشمی سے اپنے دین کو ان کے جدامجد حضرت ابراہیمؑ کا صحیح دین کہا تھا اور پھر بار بار بلکہ پورے مکی دور میں اسے دین ابراہیمی کی اصل قرار دیا

اورقرآن مجید نے اس کی بہت تصدیق کی ۔اصل دین ابراہیمی کی لوٹنے کی دعوت محمدی نے قریشی مخالفین کے ساتھ یہودی وعیسائی ناقدین کا منہ بند کردیا تھا۔ وہ لاچار ہوگئے تھے ۔ یہ ایک عمدہ تحقیق ہوسکتی ہے جو سیرت نبوی اور دعوت اسلامی کی مضبوط جڑوں کا سراغ لگانے کے علاوہ دوسرے حقائق سامنے لاسکتی ہے ۔ (۴۷)

قرآن مجید کی تمام مکی سورتوں میں اصل دین ابراہیمی اور حقیقی ملت حنفی کا بیان انبیائے کرام اور اعمال وافکار کے حوالہ سے آتا ہے اور دوسری طرف بہت سی آیات میں قریشی خرافات اور عربی انحرافات کا ذکر کرکے ان کو اصل دین وملت براہیمی کا مخالف بتایا جاتا ہے ۔ یہ بھی ایک اہم باب تحقیق ہے جو سیرت نبوی کی خفتہ جہات کو جگادے گا ۔ (۴۸) ملاحظہ ہو ابن اسحاق/ابن ہشام ۱/۱۶۲: ''فقال (ابو طالب) رسول اللہ ﷺ : یا ابن اخی ! ما ھذا الذین الذی اراک تدین بہ؟ قال : ای عم ، ھذا دین اللہ ، و دین ملائکتہ ، و دین رسلہ و دین انبیاء ابراھیم ......'' ابوطالب سے متشددین اکابر قوم نے اپنے ایک وفد میں شکوہ کیا تھا: ''یا ابا طالب ! ان ابن اخیک قد سب آلھتنا ، و عاب دیننا ، و سفہ احلامنا ، و ضلل آباء نا'' اور اس شکوہ کی تکرار بار بار ملتی ہے ۔ ابن اسحاق ۱/۱۶۹ ومابعد ۔ (۴۹) قریشی طبقات اکابر کا تذکرہ اصل بحث میں بہت تفصیل سے آچکا ہے اور ان کے متعدد مآخذ ومصادر سے اس کو مدلل کیا جاچکا ۔ یہاں یہ نکتہ ابھارنا موزوں لگتا ہے کہ مخالفت وعداوت کی ایک سرشت ہوتی ہے اور فسادیوں اور فتنہ پردازوں کی ایک سیاست اور وجہ یہ ہے کہ جاہل اور ناسمجھ افراد اور طبقات خاص کر کم فہم بچوں اور لڑکوں کو اور ان سے زیادہ اوباشوں کو ان کی فطری کجی کے سبب اشخاص وافکار کے خلاف لگادیتے ہیں ۔ مآخذ میں ایسے سفیہان قریش وثقیف وغیرہ کا ذکر ملتا ہے اور ان کے لیے جاہل عرب (جھلۃ العرب/جھلۃ قریش) کا بھی ۔ سیرت نبوی میں ایک تحقیق کا یہ بھی باب ہوسکتا ہے ۔ (۵۰) چند اکابر فساد اور فتنہ اپنی مفسدانہ حرکتوں سے ایک عمومی مخالفت اور عام عداوت کا ماحول کیسے بناتے ہیں اس کا ایک نمونہ سیرت نبوی میں قدم قدم پر ملتا ہے ۔ وہ تاریخ انبیاء وتہذیب اسلامی کا بھی ایک اہم باب ہے ۔قومی عصبیت ، ملکی مفاد ، وطنی محبت اور خاندانی حمایت وغیرہ کے نعروں کے ذریعہ عوامی مخالفت کا ماحول بنایا جاتا ہے ۔ رسول اکرمؐ اور اسلامی دعوت کے خلاف انتہا پسند اکابر قریش نے ایسا ہی عوامی رویہ بنادیا تھا جس میں کوئی سچ سننے اور سمجھنے کے لیے تیار نہ ہوتا تھا ۔ اکابر قریش میں سے متعدد کا یہ کام رہ گیا تھا کہ وہ مکہ میں ہر آنے جانے والے کو شروع ہی سے رسول اکرمؐ اور دین سے برگشتہ کردیں ۔ ان کے کان ایسے بھرے جاتے کہ قرآنی الفاظ میں ان میں ٹھیٹ پڑ جاتے اور قلوب پر قفل چڑھ جاتے لیکن ان کی اسی عام مخالفانہ

مہم نے صاحبان عقل وبصیرت کو سننے سمجھنے پر مجبور بھی کیا تھا۔حضرت طفیل بن عمرو،عفیف کندی،حارث بن عبدالعزیٰ اور دوسرے قبائل بدوی کے اکابر نے اسی طرح اسلام و دین سمجھا تھا۔ابن اسحاق/ابن ہشام ۲/ ۲۰-۲۱:...... **وجعلت قريش ...... يحذرونه الناس ومن قدم عليهم من العرب** الخ ومابعد۔ (۵۱) بخاری/صحیح الباری، باب اسلام عمر بن الخطاب۔ابن اسحاق/ابن ہشام ۱/۱۸۴ او مابعد؛۲۱۸ ومابعد اسلام حمزہ وعمر بالترتیب۔(۵۲) مقالہ کی بحث اور اس کے مآخذ ومصادر۔(۵۳) ابن اسحاق/ابن ہشام ۲/۱۲-۱۶ ومابعد نیز ۲/۴۴ ومابعد۔(۵۴) صحیفہ مقاطعہ کے منسوخ کرنے والے اکابر قریش نے اس کے لکھے جانے اور مقاطعہ کیے جانے کے خلاف ہونے کو واضح کیا تھا۔شریف الطبع اکابر کی خاموشی دراصل تشدد پسندوں کے عوامی غلبہ کی وجہ سے تھی اور یہ ہر سماج میں ہوتا ہے کہ مٹھی بھر فسادی پوری قوم کو یرغمال بنا لیتے ہیں۔(۵۵) عتبہ بن ربیعہ عبشمی کا تجزیہ اخلاص او پر گذر چکا اور اسی طرح ولید بن مغیرہ مخزومی کا دعوت اسلامی پر ردعمل بھی مذکور ہو چکا۔اول الذکر شیخ قریش پر ایک خاص تحقیقی مقالے کی ضرورت ہے۔(۵۶) بنوعبد مناف کی دعوت نبوی میں اور دوسرے مواقع پر رسول اکرمؐ نے غلبہ اسلام اور فرماں روائی عرب کا ذکر کیا تھا۔ملاحظہ ہو خطبات نبوی: ''**عرض رسول اللهؐ نفسه على القبائل**'' کے باب مآخذ میں کئی اکابر عرب نے اسی عالمی اقتدار نبوی کا حوالہ دیا تھا: بلاذری ۱/۱۵۵ ومابعد؛ ابن اسحاق/ابن ہشام ۲/۶۶۔صرف ایک سردار بنی عامر بن صعصعہ کا تاثر وبیان یہ ہے کہ اگر قریش کا یہ نوجوان میرے ہاتھ آجائے تو میں عرب پر چھا جاؤں: ''**والله لو انى اخذت هذا الفتى من قريش لاكلت به العرب......**'' ۔(۵۷) تفسیر ابن کثیر وطبری وغیرہ ملاحظہ ہوں۔ (۵۸) تفسیر سورہ روم؛ ابن کثیر ۳/۳۹۵ ومابعد میں بہت سی احادیث اور روایات ہیں۔جن میں غلبہ مسلم کا بھی حوالہ ہے۔(۵۹) یہ آیت کریمہ بہت اہم ہے۔مکی دور میں اس برملا اظہار کی اہمیت یہ ہے کہ واقعات وحقائق زمینی نے اس کی تصدیق کردی۔نیز تفسیر ابن کثیر وغیرہ کی روایات واحادیث۔(۶۰) عام مفسرین اس آیت کریمہ میں ''فرض'' کا اور ''معاد'' کا صحیح ترجمہ نہیں کرتے اور ان کو بالترتیب نزول اور آخرت سے تعبیر کرتے ہیں حالانکہ الفاظ قرآنی اور ان کا نظم ان کے دوسرے اور صحیح معانی بتاتا ہے۔ملاحظہ ہوں اردو عربی تفاسیر خاص کر ابن کثیر۔مودودی نے اپنے حواشی سورہ میں ترجمہ فرض کیا ہے مگر معاد سے مراد دنیاوی ودینی اقتدار مراد ہی نہیں لیا بلکہ ان مفسرین کی تعبیر کو غلط ٹھہرانا ہے جو''معاد'' سے مراد مکہ لیتے ہیں۔موصوف کے دلائل دلچسپ ہیں خاص کر ان کا یہ تبصرہ کہ یہ ابن عباس کی رائے ہے،کوئی حدیث مرفوع نہیں کہ اسے ماننا لازم ہو۔(۶۱) مسلم

تمکن کی آیات کریمہ کا مطالعہ مختصراً حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنے حواشی قرآن میں کیا ہے اور مفسرین کے ہاں روایات بھی ہیں مکی سورتوں میں گذشتہ اقوام اور مسلم تمکین کی بھی آیات ہیں جیسے اعراف: ۱۰؛ احقاف: ۲۶؛ انعام: ۶؛ قصص: ۶؛ ۵۷ (مکہ میں قریش کی تمکین خانہ کعبہ کے حوالے سے)؛ یوسف: ۵۴ (حضرت یوسفؑ کی تمکین)۔(۶۲) بخاری رفتح الباری، حدیث ہرقل ۱/۴۳-۶۰ بالخصوص حدیث بخاری: ۷-۸: ہرقل کے نام فرمان نبوی میں حضرت ابوسفیان کا خاص تاثر یوں نقل کیا گیا ہے: ''......لقد أمِرَ امرُ ابن ابی کبشة ، انه یخافه ملک بنی الاصفر ؛ فما زلت موقنا أنه سیظهر حتی ادخل الله علی الاسلام'' خود شاہ ہرقل کا اعتراف تھا: ''فان کان ما تقول حقا فیسلمک موضع قدمی هاتین ......'' نیز بحث حافظ ابن حجر عسقلانی جس میں طبرانی وغیرہ کی روایات ہیں جو ابوسفیان بن حرب اور دوسرے اکابر قریش کو مرعوب کر گئی تھیں۔(۶۳) مآخذ سیرت وحدیث میں ان واقعات کا مختلف ابواب میں ذکر ہے اور ہجرت نبوی کے حوالے سے زیادہ ہے۔ بخاری رفتح الباری ۷/۲۸۱ ومابعد: '' باب هجرة النبی ﷺ واصحابه الی المدینة'' ۔ ابن اسحاق رابن ہشام ۲/۹۶ ومابعد؛ متعدد جدید سیرت نگاروں نے رسول اکرمؐ کو قتل کر دینے کے قریشی اکابر کے فیصلہ کو مکی دور کے اوائل سے ہی متعلق کیا ہے اور ہر مخالفت وعداوت کے موقع کو قتل کرنے کا موقع بتاتے ہیں حالانکہ وہ آخری فیصلہ تھا جو ہجرت نبوی کے قریب کے زمانے میں کیا گیا تھا۔ عقبہ بن ابی معیط اموی کے گلا گھوٹنے کے واقعہ میں حافظ ابن حجر نے بعض صحابہ کرام کا خیال پیش کیا کہ وہ اول موقع تھا جب آپؐ کو قتل کرنے کی کوشش کی گئی۔(۶۴) ابن سعد ۱/۱۰۲؛ ''......ودعا بنیه وقومه فقال، تلبسوا السلاح وکونوا عنه ارکان البیت فانی قد اجرت محمدا......'' ؛ بلاذری ۱/۱۵۰ ''...... ثم الی مطعم بن عدی فاجاره ، فدخل فی جواره ، ولبس قومه السلاح حتی ادخلوه المسجد فکان رسول الله ﷺ یشکرها لمطعم بن عدی'' دوسرے مآخذ میں اس سے زیادہ تفصیل ملتی ہے کہ مطعم بن عدی کے جوار دینے پر اکابر قریش نے متفقہ طور سے کہا تھا کہ آپ نے رشتہ داری اور قرابت کا حق ادا کیا اور ہم نے بھی اسے جوار دی جسے آپ نے جوار دی۔ نیز ملاحظہ ہو: ابن سعد ۱/۱۰۱-۱۰۲۔

بریلی میں اردو شاعری کا ارتقاء
(۱۷۴۹ء تا ۱۹۴۹ء)

سید لطیف حسین ادیب

روہیل کھنڈ میں بالعموم اور بریلی میں بالخصوص اردو شاعری کا آغاز روہیلوں کی آمد اور روہیل کھنڈ کی تشکیل کے ساتھ ہوا۔ ہندوستان میں افغان مدت مدید سے موجود تھے لیکن شمالی مغربی ہندوستان کے علاقہ ردہ کے پٹھان بزمانۂ فرخ سیر (م ۱۷۱۹ء) کٹھیر وارد ہوئے اور انہوں نے رفتہ رفتہ محمد شاہ (م ۱۷۴۸ء) کے عہد حکومت میں ہی اقتدار حاصل کرلیا۔ علی محمد خان (م ۱۷۴۹ء) نے جو پٹھان نہیں تھا بلکہ ایک روہیلہ قسمت آزما داؤد خاں (م ۱۷۲۶ء) کا متبنّٰی تھا، روہیلوں کی قیادت کی اور آنولہ (ضلع بریلی) کو روہیلہ اقتدار کا صدر مقام بنایا۔ علی محمد خاں کے بعد حافظ رحمت خاں روہیلہ (م ۱۷۷۴ء) نے روہیلوں کی قیادت کی اور پایان کار جنگ روہیلہ (۲۳/اپریل ۱۷۷۴ء) میں روہیلہ اقتدار کا خاتمہ ہوگیا۔

روہیلوں کی آمد سے پہلے یہ علاقہ کٹھیر کہلاتا تھا کیونکہ اس علاقے میں کٹھیر یا راجپوتوں کو بالادستی حاصل تھی۔ حکومت مغلیہ کا صوبہ دار ضرور رہتا، جاگیردار بھی اپنی جاگیر کا انتظام کرتے لیکن چھوٹے بڑے راجپوت زمیندار اپنے اقتدار کے لیے نبرد آزما رہے۔ کٹھیر میں روہیلوں کے مسلط ہونے کے بعد کٹھیر کا علاقہ روہیل کھنڈ کہلایا نجم الغنی نے اخبار الصنادید میں تحریر کیا:

"کٹھیر کی حدود روہیل کھنڈ کی حدود موجودہ حال کو شامل تھیں"۔

(ج ۱، ص ۵۰)

حدود موجودہ حال سے مراد روہیل کھنڈ کمشنری ہے جس میں اضلاع بجنور۔ مراد آباد۔

---

۷۳ پھول والان، بریلی (یوپی) ۲۴۳۰۰۳۔

رامپور۔ بریلی۔ بدایوں۔ پیلی بھیت اور شاہ جہان پور شامل تھے۔

علی محمد خاں اور حافظ رحمت خاں کا زیادہ وقت اندرونی اور خارجی خلفشار کو دور کرنے اور روہیلہ اقتدار کو مستحکم کرنے میں صرف ہوا۔ اس کے باوجود روہیلوں کے دور عروج میں علوم وفنون نے بہت ترقی کی۔ سید الطاف علی بریلوی نے اپنی موقر تالیف حیات حافظ رحمت خاں میں تحریر کیا:

> ''حافظ الملک کے عہد حکومت میں روہیل کھنڈ میں پانچ ہزار علماء اور فضلاء مساجد اور سرکاری مدارس میں درس وتدریس میں مشغول تھے۔ ہر ایک عالم اور فاضل کی اس کے علم وفضل کے موافق تنخواہ مقرر تھی۔ تمام مدرسوں میں کتب درسیہ بڑے بڑے علماء کے مشورے سے حافظ الملک خود مقرر فرماتے تھے اور طالب علموں کو مقرر شدہ کتابیں حکومت کی طرف سے مفت مہیا کی جاتی تھیں۔ ملازمین سرکار کے لڑکوں کے علاوہ تمام طالب علموں کو قیام وطعام کی سہولتوں کے علاوہ فرداً فرداً سو روپیہ سالانہ بطور جیب خرچ بھی دیا جاتا تھا''۔ (ص ۲۸۲)

علی محمد خاں، حافظ رحمت خاں، امرائے سلطنت، ان کی اولاد اور مقربین، سب ہی مربیان سخن تھے۔ ان میں سے ہر ایک نے مقامی اور شعرائے بیرون جات کی سرپرستی کی اور آنولہ بریلی میں کثرت سے شعراء جمع ہوگئے۔ یہ حق بات ہے کہ بنگش پٹھانوں نے فرخ آباد میں اور روہیلہ پٹھانوں نے آنولہ بریلی میں دہلی کے اجڑنے کے بعد، محفل سخن جمالی تھی۔ اس وقت فیض آباد کو نمود تھا۔ لکھنؤ بے نمود تھا۔ پٹھانوں کی تباہی کے بعد ہی لکھنؤ کو پہچان ملی اور وہاں دلی اور روہیل کھنڈ کے شعراء نے شاعری کو ترقی دی۔

یہ سمجھنا صحیح نہیں ہوگا کہ بریلی میں شاعری کا آغاز روہیلہ پٹھانوں کے اقتدار کے ساتھ ہوا۔ دراصل دور مغلیہ میں ناظموں اور صوبے داروں کے عہد میں بریلی میں جہاں علماء اور فقراء آئے وہاں شاعر بھی وارد ہوئے۔ خود بریلی کے ناظم اور صوبے دار شاعر تھے اور شعراء کے مربی۔ حکیم عین الملک حسین مرزا شیرازی دوائی (م ۱۵۹۴ء) مرزا رفیع خان باذل (م ۱۷۱۲ء) حکیم عبدالرزاق مشرب (م ۱۷۱۵ء) نواب ہدایت یار خاں ضمیر (م ۱۷۵۲ء) وغیرہ نے بریلی میں فارسی شعر وادب کو فروغ دیا۔ اس طرح بریلی میں شعر وشاعری کی مٹی پہلے سے زرخیز تھی۔

روہیلوں کی آمد اور اقتدار سے ریختہ کا شجر لگا۔ دہلی رامپور بریلی، بدایوں اور فرخ آباد میں اردو شاعری کی اٹھارویں صدی عیسوی میں افزائش باہمہ گر مربوط معلوم ہوتی ہے۔

اٹھارویں صدی عیسوی میں شمالی ہند کا اردو شاعر کسی بھی لسانیاتی منطق میں مقیم ہو اس کی زبان شاعری دہلی کی زبان اور محاورے کے مطابق تھی کیونکہ اساتذۂ دہلی کا کلام معیار سخن تھا۔ ہاں مختلف منطقوں کے مقامی اثرات کو اشعار میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً روہیلہ پٹھان پشتو بولتے ہوئے آئے تھے۔ ان کی معاشرت دوآبے کی معاشرت سے جدا تھی۔ ان کا لباس، رسوم، لوک گیت اور ساز ونغمات پر ان کے اپنے علاقے کی سماجیات کی چھاپ تھی۔ ان کا اپنا مزاج اور رویہ تھا۔ ان کی زندگی تکلف اور تصنع سے عاری تھا۔ ان میں بے حد جفاکشی، بہادری اور بے باکی تھی۔ ان کو اپنے خاندان، اپنے قبیلے، اپنی تلوار، اپنے گھوڑے اور اپنی رسوم سے بہت محبت تھی۔ ان کا مزاج حربی تھا۔ لہٰذا ان کی زبان اور معاشرت کا کچھ نہ کچھ اثر مروجہ زبان اور سخن پر ضرور پڑا جس کو امتیاز علی خاں عرشی رامپوری نے اپنی کتاب ''اردو اور افغان'' میں تلاش بھی کیا۔ جہاں تک معاشرتی اثر کا تعلق ہے تو وہ بھی نایاب نہیں ہے۔ مثلاً مغل اور ترک کلاہ استعمال کرتے تھے۔ ان کا امرد کج کلاہ ہے۔ روہیلہ پٹھانوں میں دستار کا رواج تھا۔ ان کا امرد لٹ پٹی دستار والا ہے۔

یہ دل ہے بے سر و ساماں تجھ بن پہنچ ۔ اُو لَٹ پٹی دستار والے

روہیلہ پٹھانوں کو حربی صفات پسند تھیں جو وہ امرد کا بھی وصف شمار کرتے تھے۔

جب کھیلنے کو پٹہ وہ رشکِ ماہ نکلا سورج ۔ چھڑی و گنگا بے صبح گاہ نکلا

لیکن یہ مثالیں عام نہیں ہیں۔ کسی بھی روہیلہ شاعر نے مروجہ زبان ومحاورے کو علاحدہ کرنے یا علاحدہ برتنے کی کوشش نہیں کی۔ انہوں نے شاعری میں اساتذۂ دہلی کا اتباع کیا۔

ایسا نہیں تھا کہ دور روہیلہ میں صرف پٹھان سخن سنج اور سخن پرور تھے۔ بریلی کے مقامی شعراء بھی شاعری کر رہے تھے۔ ان دونوں گروہوں میں فارسی زبان اور ادب قدر مشترک تھی۔ لہٰذا جمالیاتی سطح پر دونوں میں زیادہ امتیاز نہیں تھا۔ حیرت اس بات پر ہے کہ روہیلہ پٹھانوں نے جن کی مادری زبان پشتو تھی اور جو اپنے گھروں میں پشتو ہی بولتے تھے، انہوں نے اردو زبان پر اتنی قدرت حاصل کر لی کہ وہ معیاری شعر کہنے لگے۔ اس وقت پشتو بولنے والوں کے لیے ریختہ گوئی

میں قدرت حاصل کرنا بھی آسان نہیں تھا کیونکہ اردو اپنے محاورے اور اسلوب کی جستجو میں تھی۔ دیباچہ تذکرۂ چمنستان شعراء (۶۱-۱۷۶۴ء) دیباچہ دیوان زادہ از ظہور الدین حاتمؔ (م ۱۷۹۲ء) اور دیباچہ تذکرۂ شورش (۱۷۷۷ء) ایسی جستجو کی شہادت دیتے ہیں۔

بہر نوع دور قدیم کے شعرائے بریلی میں، وہ مقامی ہوں یا نو وارد پٹھان، ان کی شاعری میں وہی معائب و محاسن ملتے ہیں جو قدماء کے کلام میں بھی ملتے ہیں۔ مشتے نمونہ از خروارے کے مصداق معائب و محاسن کی مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

معائب: ایہام اور رعایت لفظی:

جو کہ حلقہ بگوش نتھ کے ہیں
ناک میں ان کے جان آئی ہے — عزت اللہ خاں جذبؔ

خارجیت وسوقیت:

اُدھر تو مسکی ہے چولی۔ اِدھر ہیں ٹوٹے بند۔
نہ جانے کس نے یہ لوٹی بہار ساری رات — بہادر سنگھ بہادرؔ

مدت سے یہ بحث درمیاں ہے
پر علم نہیں کمر کہاں ہے — حسن علی شوقؔ

سگِ لیلیٰ کو شاید قیس کا دھوکا ہوا یارو
جوسن کر شب مری زنجیروں کی جھنکار اٹھ بیٹھا — ذو الفقار علی صفاؔ

محاسن: داخلیت:

کن حسرتوں سے چھوڑ کر ہم یہ جہاں چلے
آئے تو حد سبک تھے پہ کتنے گراں چلے — محمد یار خاں امیرؔ

زندگی جب ہوئے گی کر لیں گے یار
ان دنوں تو موت بھی ہم کو نہیں — عزیز خاں بے جانؔ

نالہ اپنا اثر نہیں کرتا
فائدہ کیا جو ہاے ہو کیجے — محبت خاں محبتؔ

روتے دیکھا مجھے ۔ تو دشمن کا
دیدہ بے اختیار بہہ آیا　　محبت خاں محبتؔ

معاملہ بندی اور محاکات:

مل گیا تھا رات کو خلوت میں وہ تنہا ۔ پر آہ
کچھ تو شرمایا وہ ۔ اور کچھ ہم بھی شرماتے رہے　　کبیر خاں تسلیم

ہائے رے سرخی ترے چہرے کی ہنگام عتاب
جتنا بگڑے ہے اتنا ہی سنور جاتا ہے　　محمد یار خاں امیرؔ

مضمون طرازی اور زور بیان:

نہ جانے شور ہے دریا میں کسی تابندہ اختر کا
کہ محراب صدف میں محوِ سجدہ سر ہے گوہر کا　　محمد یار خاں امیرؔ

تھر تھراتا ہے اب تلک خورشید
سامنے تیرے آ گیا ہوگا　　//

منہ سے ذرا اٹھا لے تو آنچل نقاب کا
بازار بہت گرم ہے کچھ آفتاب کا　　قدرت اللہ شوقؔ

جب شانہ صفت دل کو ۔ میں صد چاک کروں گا
کوچے میں گذر زلف کے ۔ بے باک کروں گا　　ہمت خاں ہمتؔ

اخلاقیات اور ضرب الامثال:

پستی طلب کر ۔ آپ کو چاہے ہے گر بلند
جب تخم زیر خاک ہو ۔ تب ہو شجر بلند　　محمد یار خاں امیرؔ

شکست و فتح ۔ میاں ۔ اتفاق ہے ۔ لیکن
مقابلہ تو دل نا تواں نے خوب کیا　　//

کون سنتا ہے فغانِ درویش
قہر درویش بجانِ درویش　　ذوالفقار علی صفاؔ

تازہ گوئی:

مغفرت ہاتھ باندھ کر آئی
دیکھ میرے گناہ کی حشمت — قدرت اللہ شوقؔ

وسعت دل یہ چاہتی ہے مری
لا مکاں پر مکاں بنایئے گا — //

شب تنگ و در پیش افسانۂ کا کل
کیوں کر کروں کوتاہ۔ حکایت یہ بڑی ہے — //

ان اشعار سے بریلی کے قدیم شعراء کی زبان اوران کے معیار سخن کو بھی سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔اس جودت طبع اور مذاق فطری کے باوصف جوان شعراء کو میسر تھا، یہ باور کرنا ہی پڑے گا کہ ان کے بناؤ اور سنگھار میں شمالی ہند کے اساتذۂ متقدمین کا بالواسطہ یا بلا واسطہ ہاتھ تھا کیونکہ بقول عبدالحق ''یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے اردو میں لطافت وشیرینی،قوت اور وسعت پیدا کی اور اس کی بنیادوں کو مضبوط کیا۔ ان کی زبان اور کلام کا اثر اب تک باقی ہے اور باقی رہے گا''۔ (تذکرۂ ہندی،ص ح) دور قدیم میں شعرائے بریلی کو اساتذۂ بیرون جات سے استفادے کا موقع بھی زیادہ ملا کیونکہ خود آنولہ بریلی میں قائمؔ و مصحفیؔ موجود تھے۔ بریلی کے شعرائے متقدمین کے اساتذہ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فہرست میں سراج الدین علی خاں آرزوؔ (م۱۷۵۶ء) جعفر علی حسرتؔ (م۱۷۸۶ء) مرزا شمس الدین مظہرؔ جان جاناں (م۱۷۸۱ء) ظہورالدین حاتمؔ (م ۱۷۹۲ء) مرزا رفیع سوداؔ (م۱۷۸۱ء) قلندر بخش جرأتؔ (م۱۷۱۰ء) وغیرہ قائمؔ و مصحفیؔ کے علاوہ شامل تھے۔لہٰذا جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے بریلی کے دور قدیم میں شاعری کی ترقی شمالی ہند کے دوسرے ادبی مراکز سے مربوط تھی۔

بریلی کے قدماء کی بھیڑ میں قدرت اللہ شوقؔ۔ محمد یار خاں امیرؔ۔عزیز خاں بے جانؔ اور محبت خاں محبتؔ بہت قدآور تھے۔

قدرت اللہ شوقؔ (م۱۸۱۰ء) بریلی کا قدیم باشندہ تھا۔علم وفضل سے آراستہ اور آسودہ حال تھا۔اس نے اپنا وقت شعر وشاعری اور علمی مشاغل میں گذارا۔اس نے اپنے متعلق تحریر کیا۔

اے شوؔق ترے شوق کا انداز کیا کہوں
عالم سے تو رکھے ہے زبان علاحدہ
اے شوؔق تیرے شعر کی اب تو پڑی ہے دھوم
سوؔدا و میؔر و قائؔم و درؔد و الؔم تلک

اس کی غزلیات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو شاعری کے دور قدیم میں جو خصوصیات غزل اساتذہ کے یہاں ملتی تھیں ان کا مجموعہ اس کا اپنا کلام ہے۔ خارجیت ہے تو خوب۔ داخلیت ہے تو خوب۔ زبان زیادہ صاف ہے۔ جو بھی ہے سلیقے کے ساتھ۔

محمد یار خاں امیؔر (م ۱۷۷۵ء) کی پرورش روہیلہ پٹھانوں کے ماحول میں ہوئی۔ اس کی جمالیاتی حس بہت بڑھی ہوئی تھی۔ اس کی غزلیات میں حسن پرستی کا عنصر نمایاں ہے۔ شدت احساس کی وجہ سے سوز و اضطراب کی کیفیت ملتی ہے۔ اخلاق اور حکیمانہ مضامین ملتے ہیں۔ زبان صاف ستھری اور پر اثر ہے۔ اپنے عہد کا نمایاں شاعر تھا۔

عزیز خاں بے جاؔن نو وارد پٹھان تھا۔ اس نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا۔ دہلی کی محفل سخن بھی دیکھی تھی۔ الفاظ کا پارکھ اور نزاکت خیال کا دلدادہ تھا۔ باوقار اور پر شکوہ اسلوب کا قائل تھا۔ واردات قلب کا اظہار بھی شوکت الفاظ سے کرتا۔ زبان پر اہل زبان کی سی قدرت بھی۔ سب ہی تذکرہ نگاروں نے اس کے اوصاف حمیدہ اور سخن مطبوع طبائع کی تعریف کی ہے۔

محبت خاں محبتؔ (م ۱۸۰۹ء) روہیلہ پٹھان تھا۔ بہت ذی علم اور ذی لیاقت تھا۔ اردو پشتو فارسی اور عربی میں شعر کہتا تھا۔ فطری شاعر تھا۔ اس کے اسلوب شعر میں اثر سوز ربودگی اور روانی ہے۔ اس کی زبان شعر سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس کا تعلق دور قدیم سے ہے۔ اس کی غزلیات پڑھنے کے بعد حیرت ہوتی ہے بریلی کے قدماء نے، خاص طور پر پشتو بولنے والے پٹھانوں نے، نصف صدی سے بھی کم مدت میں زبان کو اس قدر سحر آفریں بنا دیا۔

دور قدیم کے شعرائے بریلی نے غزل کے علاوہ دیگر اصناف سخن میں بھی طبع آزمائی کی۔ انہوں نے مثنویات تحریر کیں۔ دور قدیم کی بعض اہم مثنویات کی تفصیل یہ ہے:

مثنوی در شدت برسات اور مثنوی در کثرت مگس: شاعر کا نام محمد یار خاں امیؔر۔ مختصر مثنویات

ہیں جن کو قدرت اللہ شوقؔ نے طبقات الشعراء میں نقل کیا (ص ۴۴۳ تا ۴۵۰)۔ پیرایۂ بیان طنزیہ اور مزاحیہ ہے۔

مثنوی اسرار محبت: شاعر کا نام محبت خاں محبتؔ۔ سال تالیف ۱۷۸۳ء۔ موضوع سسی پنوں کی عشقیہ کہانی۔ یہ مثنوی تحلیل جذبات اور برمحل زبان کا عمدہ نمونہ ہے۔ یہ مثنوی شائع ہوچکی ہے۔

دوندے خاں نامہ: شاعر کا نام محمد مہدی موتیؔ۔ زبان فارسی۔ موضوع در مدح نواب دوندے خاں (م ۱۷۷۰ء) حاکم لبولی بدایوں۔ یہ مثنوی ماہنامہ برہان دہلی بابت نومبر ۱۹۴۹ء میں شائع ہوچکی ہے۔

لاٹھی نامہ: شاعر کا نام فضل علی ممتازؔ۔ اصلاً دہلوی۔ آنولہ بریلی میں مقیم ہوا۔ موضوع لاٹھی کے فائدے۔ پوری مثنوی نہیں ملتی۔ اس کے کچھ اشعار میر حسن نے اپنے تذکرے میں نقل کیے ہیں (ص ۱۶۰)۔ زبان صاف اور اسلوب دلچسپ ہے۔

جنگ نامہ ضابطہ خاں: شاعر کا نام محمد اکرم اکرامؔ۔ ضابطہ خاں امیر الامراء نواب نجیب الدولہ (م ۱۷۷۰ء) کا پسر تھا۔ ضابطہ خاں اور مرہٹوں کے مابین ۱۷۷۱ء میں لڑائی ہوئی جو جنگ سکرتال کے نام سے مشہور ہے۔ اس مثنوی میں اسی جنگ کے حالات پیش کیے گئے ہیں۔ قدرت اللہ شوقؔ نے اپنے تذکرے میں اس مثنوی کا ایک شعر نقل کیا ہے (ص ۵۵۸)۔

جنگ نامہ آصف الدولہ: شاعر کا نام معظم عباسی معظمؔ۔ اس مثنوی کا مخطوطہ صولت لائبریری رامپور میں محفوظ ہے۔ اس کا موضوع وہ لڑائی ہے جو رامپور کے پٹھانوں اور آصف الدولہ و کمپنی کی مشترکہ افواج کے مابین ۲۴/ اکتوبر ۱۷۹۴ء کو موضع بھٹورا (فتح گنج غزلی ضلع بریلی) کے میدان میں ہوئی تھی۔

مذکورہ دونوں جنگ ناموں کی یہ اہم خصوصیت ہے کہ ان میں حسب موقع وہ الفاظ محاورات اور روزمرہ بھی مستعمل ہوئے جو روہیلہ پٹھان عام طور پر بولتے تھے۔

سرود جاں نواز اور ظفر نامہ: شاعر کا نام قاضی نورالحق منعمؔ۔ زبان فارسی۔ منعمؔ اپنے عہد کا زبردست فارسی داں اور عالم تھا۔ عہدۂ قضا پر فائز تھا۔ ان مثنویات کی اطلاع امیرؔ مینائی نے تذکرۂ انتخاب یادگار میں دی ہے۔ (ص ۳۴۸)

دورِ قدیم میں مثنویات کے علاوہ شعرائے بریلی کے تحریر کردہ قصائد کے حوالے بھی ملتے ہیں۔ قدرت اللہ شوقؔ نے طبقات الشعراء میں محمد یار خاں امیرؔ کے قصائد کے متعلق تحریر کیا:

''دیگر قصائد آں امارت پناہ نہایت پرزور و رنگیں ہستند۔ خصوصاً قصیدۂ نعت و قصیدۂ سامانِ ہولی کہ در تتبعِ قصیدہ رزمیہ بہار مرزا رفیع گفتہ۔ ہمہ انتخابی است۔ تا کجا نوشتہ بود''۔ (ص ۴۵۱)

امیرؔ مینائی نے انتخاب یادگار میں (ص ۳۴۸) قاضی نورالحق منعمؔ (م ۱۸۰۸ء) کے ایک فارسی قصیدے کا ذکر کیا جو اس نے نواب نصر اللہ خاں (م ۱۸۱۰ء) کی مدح میں تحریر کیا اور جس کا مطلع ہے ۔

سکندر باشد آئینہ دارد و آبکشی خضرش
چو فغفور و چو قیصر بردرش پاسباں بینی

دورِ قدماء میں ہجو نگاری کافی مقبول تھی اور تذکرات میں ہجو نگاروں کے حوالے ملتے ہیں۔ شعرائے بریلی کے سلسلے میں محمد یار خاں امیرؔ سے نعیم اللہ خاں نعیمؔ تک ہجو نگاروں کے اسماء ملتے ہیں جن میں نعیمؔ زیادہ مشہور ہوا کیونکہ اس نے سوداؔ کی ہجو لکھی تھی۔ نعیم اللہ خاں نعیمؔ کا حوالہ میر حسن شوقؔ اور مصحفیؔ کے تذکرات میں ملتا ہے (ص ۱۸۱، ۲۸۰، ۲۵۹ علی الترتیب)۔ مذکورہ ہجو کا ایک بند نمونۂ مندرجۂ ذیل ہے ۔

ہمارے ایک مشفق ہیں پھپھیلے　　کچھ اک میٹھے ہیں کچھ کڑوے کسیلے
جہاں جاتے ہیں یہ۔ واں ان کے چیلے　　کوئی کھینچے ۔ کوئی ان کو ڈھکیلے
ہمارے میرزا صاحب نویلے
بہت خوش ہو کے کھاتے ہیں کریلے

دورِ روہیلہ میں قطعات ۔ قطعہ بند غزلیات ۔ مسدسات ۔ رباعیات وغیرہ وافر تعداد میں ملتی ہیں۔ لیکن دورِ قدیم میں بریلی کے کسی شاعر کو، اس قلیل سرمائے کی روشنی میں جو ہمدست ہوا، یہ کہہ کر ممتاز نہیں کیا جاسکتا کہ وہ رباعی گو یا قطعہ نگار تھا۔

عہدِ روہیلہ میں بریلی میں صوفیوں اور عالموں کی بھیڑ لگ گئی تھی۔ قدیم شعرائے بریلی

کی غزلیات میں، عام روش کے مطابق، دو ر چار اشعار ایسے ضرور مل جاتے ہیں جن میں وعظ و حکمت اور اخلاق و تصوف کے مضامین ہوتے تھے لیکن کسی بھی شاعر کو واضح طور پر حمد و نعت گو منقبت نگار اور صوفی نہیں کہا جاسکتا۔

مجموعی طور پر بریلی کے دور قدیم کے شعراء نے آنے والی نسل کے لیے زبان شعر اور اسلوب شعر کا قیمتی نمونہ چھوڑا اور زبان و اسلوب کو اس قابل کردیا کہ بقول محمد یار خاں امیرؔ ـ

شعر جس داب سے کہے ہے امیرؔ روبرو اس کے فارسی کیا ہے
دیکھ لو۔ کیوں نہ لے کے اس کے سخن ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے

بریلی کی شاعری کے عہد مابعد یا دور متوسط میں قدماء کا اسلوب سخن منتقل ہوا اور ان کے تلامذہ نے ہی چراغ شاعری روشن رکھا اور روشنی پھیلائی۔ انیسویں صدی عیسوی میں بریلی کی شاعری قدماء کی رہین منت ہے۔

۲۳/اپریل ۱۷۷۴ء کو نواب حافظ رحمت خاں نے شجاع الدولہ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی افواج کے مقابلے میں شکست کھائی۔ شجاع الدولہ نے فتح بریلی کے بعد جس بربریت کا مظاہرہ کیا اس کی المناک کہانی اخبار الصنادید، ج ۱، تاریخ ہند از مولوی ذکاء اللہ اور کمپنی کی حکومت از باری لائل پوری میں پڑھا جاسکتا ہے۔ حد یہ ہے کہ وہ قلعہ اور مکانات جس میں روہیلہ امراء رہتے تھے، ان کو اس طرح مسمار کیا کہ ان کے نشانات بھی مٹ گئے۔ بریلی میں مبارک محل جس میں نواب حافظ رحمت خاں رہتے تھے اس کے متعلق قیاس کیا جاتا ہے کہ وہ شہر کہنہ بریلی میں مرزائی مسجد کے قریب تھا۔ اس کے بھی آثار نابود کردیے گئے۔

اس المناک تباہی کا اثر بریلی کی ادبی زندگی پر پڑا۔ ایک طرف سرمایۂ کتب تلف ہوا تو دوسری طرف شعراء نے بریلی سے ترک وطن کیا۔ شعراء کی اکثریت لکھنؤ پہنچی۔ بعض شعراء رام پور گئے جو معاہدۂ لال ڈانگ (اکتوبر ۱۷۷۴ء) کے مطابق وجود میں آچکی تھی۔ بعض شعراء دکن تک پہنچے۔ بریلی کے حالات دن بہ دن خراب ہوتے گئے۔ آصف الدولہ (م ۱۷۹۷ء) کے عہد میں بریلی میں کوئی ترقی نہیں ہوئی۔ بوجہ زرکشی اور استبداد معاشی بدحالی اور افراتفری کا ماحول پیدا ہوا۔ ۱۸۰۱ء میں بریلی پر ایسٹ انڈیا کمپنی نے قبضہ کیا جس سے منافرت پھیلی۔ ۱۸۰۵ء میں امیر خاں

نے بریلی اوراس کے مضافات میں لوٹ مار کی۔اسی سال بریلی میں بھیانک قحط پڑااور بیسلپور کے زمینداروں نے شورش برپا کی۔۱۸۱۳ء میں نیپالیوں سے جنگ ہوئی جس کا سلسلہ کئی برس جاری رہا۔۱۸۱۶ء میں اہالیان بریلی نے ریگولیشن ایکٹ کے خلاف بغاوت کی۔۱۸۳۷ء میں بریلی میں پہلی بار ہندو مسلم فساد ہوااوراسی سال قحط بھی پڑا۔اس طرح ۱۷۷۴ء میں روہیلوں کے زوال سے ساٹھ پینسٹھ برس بعد تک بریلی میں سخن سنجی کی فضا سازگار نہیں تھی۔انیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار کے ساتھ بریلی میں انگریز نواز طبقہ پیدا ہوا جو امراء،زمینداراور بڑے تاجروں پر مشتمل تھا۔اس طبقے نے معاشی بدحالی کا شکار شعراء کی کچھ نہ کچھ سرپرستی کی جس سے شاعری کا تنفس قائم رہا۔

اس عہد کے شعراء کو مندرجہ ذیل حدوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱-وہ کم تعداد شعراء جو پرآشوب حالات کے باوجود بریلی کے باہر نہیں گئے۔

۲-وہ شعراء جو بریلی سے ترک وطن کر کے دیگر شہروں میں مقیم ہوئے۔

۳-وہ شعراء جن کا عہد شاعری انیسویں صدی عیسوی کے نصف اول کو محیط ہے اور جنھوں نے بریلی میں شاعری کا احیاء کیا۔

قسم اول کے شعراء میں اہم ترین شاعر حضرت شاہ نیاز احمدؒ نیاؔز (م۱۸۳۴ء) تھے۔وہ ایک بلند پایہ صوفی،عالم اور شاعر تھے۔ان کا بیشتر کلام فارسی میں اور کمتر عربی واردو میں ہے۔وہ بریلی کی صوفی شاعری کے امام ہیں۔ان کی شاعری سے بریلی کو منزلت ملی۔بریلی میں شاعری تصوف کے رموز ونکات اور صوفیانہ لفظیت واسلوب سے آشنا ہوئی۔بریلی کی تاریخ شاعری میں یہ غیر معمولی کارنامہ تھا۔

قسم دوم کے شعراء میں میر غلام علی عشرؔت (م۱۸۲۱ء)۔حسین شاہ حقیقؔت (م۳۳-۱۸۳۴ء) فارغ شاہ فارؔغ (م۱۸۴۰ء) ذوالفقار علی صفؔا (م۱۸۴۵ء) اور شیخ علی بخش بیمؔار (م ۱۸۵۴ء) بہت بلند قامت ادیب اور سخن سنج تھے۔

میر غلام علی عشرؔت رامپور میں مقیم ہوا۔ریاست رامپور وجود میں آچکی تھی۔اس کا تعلق امرائے رامپور سے پیدا ہوا۔چنانچہ اس کی غزل پر درباری اثرات مرتسم ہوئے۔اس کی غزلیات

ارباب نشاط میں بہت مقبول تھیں۔اس کو کل ہند شہرت بھی ارباب نشاط کے ذریعہ ملی۔عشرت کی شہرت کا مدار،اس کی غزلیات کے علاوہ،مثنوی پدماوت اور منثور داستان سحرالبیان کی وجہ سے بھی ہے۔عشرتؔ کا یہ کارنامہ ہے کہ اس کے تلامذہ نے بریلی میں شعروشاعری کو فروغ دیا۔

حسین شاہ حقیقتؔ نوجوانی میں لکھنؤ وارد ہوا۔جراتؔ سے رجوع کیا۔اس کی غزلیات کی زبان قدیم الفاظ سے معرا اور صاف وسلیس ہے۔اس کے اشعار میں جذبے اور تخیل کی کمی محسوس ہوتی ہے۔اس کو شہرت مثنویات اور منثور کتب سے ملی۔اس کی منثور کہانی جذب عشق (۱۷۹۷ء) اپنے عام فہم اور بامحاورہ اسلوب کی وجہ سے اردو نثر اور اردو ناول کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

فارغ شاہ فارغؔ تلمیذ ظہورالدین حاتمؔ (م ۱۸۹۲ء) بریلی سے لکھنؤ اور لکھنؤ سے خورجہ پہنچا۔فقر وتصوف سے علاقہ رکھتا تھا۔اس کا دیوان غزلیات اور مثنویات ہمدست نہیں ہوئیں۔اس کے جو اشعار تذکرات میں منقول ہوئے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ پختہ کار تھا۔شکوہ بیانی سے دلچسپی تھی۔اس کی زبان پر قدامت کے اثرات بھی کم ہیں۔

ذوالفقار علی صفاؔ تلمیذ میر تقی میرؔ بریلی سے لکھنؤ۔لکھنؤ سے بنگال۔بنگال سے چنیا پٹن مدراس۔مدراس سے حیدرآباد دکن اور حیدرآباد سے احمد آباد پہنچا۔بڑی صلاحیت کا شاعر تھا۔یہ شعر اسی کا ہے ؎

کون سنتا ہے فغانِ درویش
قہر درویش بجانِ درویش

صفاؔ غزل مثنوی قصیدہ غرض کہ کسی صنف سخن میں قاصر نہیں تھا۔کوثر سے دھلی ہوئی بامحاورہ اور سلیس زبان استعمال کرتا۔بریلی سے دور ہوجانے کی وجہ سے بریلی میں گمنام رہا۔

شیخ علی بخش بیمارؔ بریلی سے لکھنؤ پہنچا اور مصحفیؔ کا شاگرد ہوا جو خود بریلی سے لکھنؤ پہنچا تھا۔بیمارؔ بعد کو لکھنؤ سے رامپور گیا۔عمدہ غزل گو تھا۔بلند خیال اور قوت بیان ولطف زبان کا حامل تھا۔بیمارؔ نے بوستانِ خیال کا طلسم بیضا کے نام سے ترجمہ کیا۔اس کا یہ منثور اردو ترجمہ مشہور ہوا۔اس نے زیادہ شاگرد جمع نہیں کیے۔بریلی میں اس کا ایک شاگرد غلام قادر خاں وحشی نعت گو کی

حیثیت سے معروف ہوا۔ بیؔمار کا یہ شعر بہت مشہور ہے اور سچ پوچھیے تو اس کے اسلوب سخن کا نمائندہ بھی ہے

کون پرساں ہے حال بسمل کا
خلق منہ دیکھتی ہے قاتل کا

تیسری قسم کے شعراء میں عبدالملک ممتاؔز (م ۱۸۵۶ء) اور خلیفہ امیرالدین آزاؔد (۶۷-۱۸۶۸ء) اس اعتبار سے اہم ہیں کہ انہوں نے بریلی کے ناسازگار ماحول شاعری میں شعر وسخن کا احیاء کیا۔ بریلی میں رہ کر بریلی کی گرتی ہوئی دیوار سخن میں پشتیبان لگائے۔

عبدالملک ممتاؔز کا تعلق سرہند کے خانوادۂ پیرزادگان سے تھا۔ اسی خاندان کے شاہ محی الدین اویسی اور ان کے فرزند نذیرالدین حسن شائق (م ۱۲۵۴ھ/۱۸۳۸ء) تھے۔ عبدالملک ممتاؔز شاہ محی الدین اویسی کا نواسہ اور نذیرالدین حسن شائقؔ کا خواہر زادہ تھا۔ مذکورہ تینوں شاعر زوال حکومت روہیلہ کے بعد بریلی سے فرخ آباد اور دکن گئے لیکن بعد کو بریلی واپس آگئے۔ شائق کی غزل تو اویسی کی طرح قدماء کے طرز پر ہے اور اس میں خارجیت کا عنصر بھی بہت نمایاں ہے لیکن اس کا نمایاں کام عطر بہار (فارسی ۱۸۰۷ء) اور مصدر فیوض (۱۸۱۴ء) ہیں۔ اس کو شہرت ایک فارسی داں کی حیثیت سے ملی۔ عبدالملک ممتاؔز مقامی طور پر مشہور اور مقبول ہوا۔ اس کا دیوان نہیں ملتا۔ جو بھی کلام ہمدست ہوا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اویسی اور شائق کی طرح خارجی نقش گری کا قائل تھا۔ داخلیت، معاملہ بندی اور شدت احساس اس کا مقدر نہیں بنے۔ مثلاً اس کی ایک مشہور غزل کا مطلع ہے

پشتِ لب اس کے سبز ہوے۔ اب بھلا ہوا
باغِ امیدِ بوسہ ہمارا۔ ہرا ہوا

یہی حال امیرالدین آزاؔد کا تھا۔ اس کا ابتدائی کلام اتنا ہی بے روح اور بے اثر تھا جتنا کہ اویؔسی۔ شائقؔ اور ممتاؔز کا۔ لیکن بعد کو اس نے داخلیت کی طرف رجعت کی اور پر اثر اشعار لکھے۔ اس نے چار دواوین یادگار چھوڑے۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مذکورہ چاروں شعراء نے انیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں

میں محمد یار خاں امیرؔ ۔ محبت خاں محبتؔ وغیرہ سے استفادہ نہ کر کے میر غلام علی عشرتؔ کی خارجیت پسندی کی تقلید کی اور مزید نقش ونگار بنانے کی کوشش کی ۔ بہرنوع یہ طرز مقبول نہیں ہوا۔ اس کے باوجود شاعری کا یہ چھوٹا سا وقت جو ادیبؔ، شائقؔ، ممتازؔ اور آزادؔ کے تیس چالیس سالہ عہد پر مشتمل ہے۔اس معنی میں بہت اہم ہے کہ بریلی میں شاعری کی محفل، نامساعد حالات کے باوجود، جمی رہی اور ان کے تلامذہ نے انیسویں صدی کے نصف آخر میں بریلی میں شاعری کو ایسا فروغ دیا کہ باید وشاید۔

شائق اور ممتاز کے عہد میں ہی ایک نووارد شاعر گنگا پرشاد رندؔ تھا۔اس نے شائق کا تلمذ اختیار کیا اور محاکات ۔ معاملہ بندی، رندی و مستی پر مبنی مضامین قلم بند کیے اور اعلیٰ تر فصیح زبان استعمال کی ۔اس کا دیوان ناپید ہوگیا۔اس کے جو اشعار تذکرات کے ذریعہ ہمدست ہوئے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی روش عشرتؔ۔ادیبؔ۔شائقؔ۔ممتازؔ اور آزادؔ سے جدا تھی۔مثلاً ؎

مانتے ہو گر برا معشوق کہنے سے ۔ تو جان
ہم تمہیں مشہور اپنا چاہنے والا کریں
روتا ہوں چپکے چپکے ، آتا ہے یار جس دم
وہ دیکھنا کسی کا ، آنکھیں چُرا چُرا کر
دل کسی قدرداں کو دیں گے رندؔ
اب اگر زندگی ہماری ہے

یہ طرز غزل انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں ہی نواب عبدالعزیز خاں عزیزؔ (م۱۸۹۱ء) کے تغزل میں تکمیل کو پہنچا۔

انیسویں صدی عیسوی کی ابتدائی دہائیوں میں اور اندازے کے مطابق زیادہ سے زیادہ ۱۸۵۲ء تک شعرائے بریلی نے جو مثنویات تحریر کیں ان کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

مثنوی ہشت گلزار: شاعر کا نام حسین شاہ حقیقتؔ ۔ سال تالیف ۱۸۱۰ء ۔ یہ تقلید ہشت بہشت از خسروؔ (سال تالیف ۱۳۰۲ء)۔ سال طباعت ۱۸۵۰ء ۔موضوع بہرام گور اور حسن بانو کی عشقیہ کہانی۔

مثنوی ہیرامن طوطا: شاعر کا نام حسین شاہ حقیقت ۔ سال طباعت ۵۱-۱۸۵۲ء ۔ یہ مثنوی ہشت گلزار سے ماخوذ ہے۔ اس کا موضوع قالب بدلنے کے واقعات سے وابستہ ہے۔

مثنوی بنات النعش: شاعر کا نام سیف اللہ ثاقبؔ (م ۱۸۱۱ء) ۔ اس کا حوالہ تذکرۂ انتخاب یادگار میں ملتا ہے ۔ (ص ۱۰۱)

مثنوی پدماوت: نصف ضیاء الدین عبرتؔ دہلوی اور نصف میر غلام علی عشرتؔ بریلوی نے تحریر کی ۔ اس مثنوی میں عبرتؔ نے جو طرز بیان اختیار کیا وہی بعد کو دیا شنکر نسیم (م ۱۸۴۳ء) کی مثنوی گلزار نسیم کا وصف خاص ٹھہرا۔ عشرتؔ نے میر حسن کی مثنوی سحر البیان کے اسلوب نگارش کو اختیار کیا ۔ موضوع قصۂ پدماوت ہے جس کو ملک محمد جائسی نے نظم کیا تھا ۔ پدماوت کی تکمیل عشرتؔ کے ہاتھ سے ۱۷۹۶ء میں ہوئی اور طباعت ۱۸۴۸ء میں ۔

مثنوی ریاض الحسین: شاعر کا نام میر غلام علی عشرتؔ ۔ سال تالیف ۱۸۰۸ء ۔ حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت مہدی آخر الزماں تک کے حالات پر مشتمل ایک ضخیم مثنوی ۔ ہنوز غیر مطبوعہ ۔

مثنوی داغِ دل: شاعر کا نام دیاناتھ وفاؔ ۔ سال تالیف ۲۱-۱۸۲۲ء ۔ موضوع عشقیہ کہانی ۔ ہنوز غیر مطبوعہ ۔

مثنوی گل و بلبل: شاعر کا نام دیاناتھ وفاؔ ۔ زبان فارسی ۔ موضوع عشقیہ کہانی ۔ ہنوز غیر مطبوعہ ۔

مثنوی چھومنتر: شاعر کا نام ذوالفقار علی صفاؔ ۔ غیر مطبوعہ ۔ موضوع عشقیہ کہانی ۔

ترجمہ مثنوی حملۂ حیدری: شاعر کا نام ذوالفقار علی صفاؔ ۔ سال ترجمہ ۱۸۲۸ء ۔ غیر مطبوعہ ۔ یہ مثنوی رفیع خاں باذلؔ (م ۱۷۱۱ء) صوبے دار بریلی (بہ سال ۱۶۷۹ء) کی مشہور مثنوی حملۂ حیدری کا آسان اردو ترجمہ ہے ۔

مثنوی عشق صادق: شاعر کا نام امیر الدین آزادؔ ۔ سال تالیف ۱۸۲۷ء یا اس سے قبل ۔ سال طباعت ۱۸۸۴ء ۔ موضوع عشقیہ کہانی ۔

مثنوی درمدح نواب عطا حسین خاں: شاعر کا نام کرامت علی خاں شہیدی (م ۱۸۴۱ء)

[اب مکتوبان زبیری کہلاتے ہیں]۔عطا حسین خاں عطاؔ کمبوہ (م ۱۸۴۱ء) شہیدی کا مربی تھا۔ شہیدی نے اس کی رفاقت میں لگ بھگ نو برس گذارے۔ یہ اس کی زندگی کے آخری سال تھے۔اس کی یہ مختصر مثنوی دیوان شہیدیؔ میں شامل ہے۔

مثنوی افسانۂ نغز : شاعر کا نام عطا حسین خاں عطاؔ۔مثنوی میسر نہیں آئی۔اس کا حوالہ شہیدیؔ نے اپنی مذکورہ بالا مدحیہ مثنوی میں دیا ہے۔

مذکورہ بالا مثنویات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شعرائے بریلی نے اس عہد کے نامساعد حالات میں مثنویات کے سرمائے میں بھی اضافہ کیا۔اس عہد کی عصری روایت کے مطابق وہ مثنویات زیادہ تر عشقیہ تھیں اوران کی زبان واسلوب میں اتنی توانائی تھی کہ ایک طرف تمثیلی اور استعاراتی اسلوب نے راہ پائی تو دوسری طرف سلیس و بامحاورہ زبان نے بھی۔مجموعی طور پر یہ سرمایۂ مثنویات بریلی میں فروغ سخن کا غماز ہے۔

حکومت روہیلہ کے زوال کے ساتھ جوتھوڑا بہت قصیدہ نگاری کا ماحول تھا وہ بھی ختم ہوگیا۔پھر بھی اس عہد میں تین قصیدہ نگار ملتے ہیں جنہوں نے اردواور فارسی میں قصائد لکھے اور بریلی میں قصیدہ نگاری کا سلسلہ ٹوٹنے نہیں دیا۔ان کے اسماء مندرجہ ذیل ہیں:

عطا حسین عطاؔ: اس نے بزبان فارسی دو قصائد لکھے۔ ۱-تاریخ جلوس آصف جاہ۔ ۲-بہ مدح نواب صمصام الدولہ ناظم الملک فرانسس ہاکنس بہادر ہیبت جنگ۔یہ قصائد ۱۸۲۷ء میں یا اس سے پہلے لکھے گئے۔ان میں قصائد کی صفات ملتی ہیں۔دونوں غیر مطبوعہ ہیں۔

رتن سنگھ زخمیؔ: متوفی ۱۸۵۱ء۔اس کا فارسی قصیدہ مسمٰی ھفت بند،سال تحریر ۱۸۳۸ء شہرۂ آفاق ہے۔یہ قصیدہ حضرت علیؓ کی مدح میں ہے جس کا متن سہ ماہی مصنف علی گڑھ بابت مارچ ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا تھا۔نہایت زوردار قصیدہ ہے۔

(باقی)

شیخ مبارک بودلے جائسیؒ
اوراودھ میں اسلام کی نشر واشاعت میں ان کی خدمات

محسن عتیق خان

شیخ مبارک بودلے جائسیؒ، جوعوام میں "حضرت شاہ سید مبارک بودلےؒ" کے نام سے مشہور ہیں، ان عظیم برگزیدہ داعیان اسلام میں سے ایک ہیں جنھوں نے ہندوستان اور بطور خاص اودھ میں اسلام کی نشر واشاعت میں اہم کردار ادا کیا۔ وہ سولہویں صدی عیسوی میں روشنی کا ایک ایسا مینار تھے جس نے اودھ کے ایک وسیع خطہ کو اسلام کی روشنی سے منور کیا اور مختلف راجگانِ اودھ کو ہدایت کا راستہ دکھایا۔

خاندان: وہ شریف النسب حسنی سادات کے اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جن کا سلسلۂ نسب حضرت عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ(۱) سے ملتا ہے۔ ان کے جداعلیٰ سید عبدالرزاق نورالعین حضرت عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی دسویں پشت میں تھے، اور چودھویں صدی عیسوی کے صوفی بزرگ سید اشرف جہانگیر سمنانی رحمۃ اللہ علیہ(۲) کی خالہ زاد بہن کے فرزند تھے۔

حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی رحمۃ اللہ علیہ جب ۷۶۴ھ مطابق ۱۳۶۲ء میں عراق کے دورے پر گئے تو جیلان بھی تشریف لے گئے جہاں سید عبدالرزاق ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے گرویدہ ہوگئے۔ جب حضرت سمنانی رحمۃ اللہ علیہ نے جیلان سے رخت سفر باندھا تو سید عبدالرزاق جو اس وقت بارہ سال کے تھے ان کے ساتھ چلنے پر بضد ہوئے اور کسی بھی طرح ان سے الگ ہوکر اپنے وطن میں رہنا گوارا نہ کیا۔ آخر کار سید عبدالرزاق کے والد سید عبدالغفور کی اجازت سے حضرت سمنانیؒ نے سید عبدالرزاق کو اپنی فرزندی میں لے لیا، اور نورالعین

ریسرچ اسکالر، شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی-۲۵۔

کے لقب سے نوازا، اور تاحیات اپنی صحبت میں رکھا۔(۳)

عبدالرزاق نے ایک سوبیس سال کی عمر پائی اور تقریباً اڑسٹھ سال حضرت سمنانیؒ کی خدمت میں گزارے۔(۴) ان کے چار صاحبزادے تھے جن کے نام اس طرح ہیں: سید حسن، سید حسین، سید فرید، سید احمد۔ جب حضرت سمنانیؒ کے انتقال کا وقت قریب آیا تو انہوں نے حضرت عبدالرزاق کے چاروں فرزندوں کو بلا بھیجا اور انہیں الگ الگ مقامات کی خلافت عطا کی اور خانقاہوں کے قیام کی ہدایت فرمائی۔ سب سے بڑے بیٹے سید حسن کو کچھوچھا، سید حسین کو جونپور، سید فرید کو ردولی اور سب سے چھوٹے بیٹے سید احمد کو جائس کی خلافت عطا کی۔(۵)

مؤخرالذکر سید احمدؒ جو بندگی میاں کے نام سے معروف ہوئے حکم کے بموجب جائس کے لیے روانہ ہوئے اور ٹھیک اس مقام پر اقامت اختیار کی جہاں حضرت سمنانیؒ دوران قیام جائس خیمہ زن ہوئے تھے اور وہاں پر ایک خانقاہ قائم کی جو حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ کی نسبت سے خانقاہ اشرفیہ کے نام سے قرب وجوار میں معروف ہوئی اور اسی نسبت سے آگے چل کر سید احمد بندگی میاں کی نسل خانوادۂ اشرفیہ کے نام سے موسوم ہوئی۔

سید احمد بندگی میاں کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے شیخ حاجی قتالؒ نے خانقاہ کا انتظام سنبھالا اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے دو پوتوں کی تعلیم وتربیت کی ذمہ داری بھی بحسن وخوبی انجام دی اس لیے کہ ان کے فرزند جناب سید جلال اوّلؒ اپنے دو صاحبزادوں شیخ سید مبارک بودلے اور شیخ سید کمال کی پیدائش کے بعد جوانی ہی میں انتقال کر گئے تھے۔(۶)

شیخ مبارک بودلے اور شیخ کمالؒ کا تذکرہ ملک محمد جائسی نے پدماوت کے شروع میں کیا ہے اور ان کی خوب خوب تعریفیں کی ہیں اور ان کے ساتھ اپنی عقیدت وارادت کا اظہار کیا ہے، وہ کہتے ہیں:

جہانگیر وے چستی نہکلنک جس چاند   وے مخدوم جگت کے ہوں اوہ گھر کے باند

ترجمہ: خاندان چشتیہ حضرت اشرف جہانگیر جو مانند چاند تمام عیوب سے پاک صاف ہے، جن کی خدمت تمام دنیا نے کی میں ان ہی کا غلام ہوں۔

اوہ گھر رتن ایک نرمرا   حاجی شیخ سبے گن بھرا

ترجمہ: ان کے گھر ایک لڑکا گوہرِ نایاب نہایت صاف وشفاف پیدا ہوا، جو تمام ہنر کا مخزن تھا اور جس کا نام حاجی شیخ تھا۔

تیہ گھر دوئی دیپک اجیارے پنتھ دئی کہنہ دیو سنوارے

ترجمہ: ان کے گھر میں مثلِ چراغ کے روشن دولڑکے پیدا ہوئے، گویا خدا نے انھیں عوام کی رہبری کے لیے پیدا کیا ہے۔

شیخ مبارک پو نیو کرا(۷) شیخ کمال جگت نرمرا

ترجمہ: اول شیخ مبارک بودلےؒ جو چودہویں کے چاند کی طرح روشن تھے، دوسرے شیخ کمال جو تمام عالم میں پاک وصاف تھے۔

دوؤ اچل دھوؤ ڈولئے ناہیں میر کھکھنہ تتھنہ ایراہیں

ترجمہ: یہ دونوں حضرات مثلِ قطب ستارہ اپنی جگہ پر قائم تھے، کوہِ سمیر اور کوہِ کشکند ھا سے بھی اعلیٰ مرتبہ تھے۔

دینھ روپ اوجوت گوسائیں کینھ کھمبھ دوئی جگ کے تائیں

ترجمہ: خدا نے انھیں خوبصورتی دی اور نور عطا فرمایا اور دنیا میں گویا دو ستون کھڑے کر دیئے ہیں۔

دھوں کھمبھ ٹیکے سب مہی دہوں کے بھار سہیٔ تھر رہی

ترجمہ: وہ دونوں ستون اس زمین کو سنبھالے ہوئے ہیں انہیں دونوں کے سہارے تمام خلقت رکی ہوئی ہے۔

جیہ در سے اوپر سے پایا پاپ ہرا نرمل بھے کایا

ترجمہ: جنھوں نے انکا دیدار اور قدمبوسی حاصل کی، ان کے تمام گناہ معاف ہوگئے اور جسم پاک وصاف ہوا۔

محمدتیٔ نچنت پتھ جیہ سنگ مرسد پیر جیہ کے ناوا کھیوک یک لاگ سوتیر

ترجمہ: اے ملک محمد! راہِ دنیا میں وہی بےفکر ہے جس کے ہمراہ مرشد و پیر ہیں، جس کو کشتی اور ملاح میسر ہیں وہ جلد سے جلد کنارے لگ جاتا ہے۔(۸)

شجرۂ نسب: شیخ مبارک بودلے کا شجرۂ نسب اس طرح ہے: شیخ مبارک بودلے بن جلال اول بن حاجی قتال بن سید احمد (بندگی میاں) بن عبدالرزاق نورالعین بن سید عبدالغفور حسن بن سید احمد جیلی بن سید ابوالحسن بن سید موسیٰ شریف بن سید علی شریف بن سید محمد شریف بن سید حسن بن سید احمد شریف بن سید ابی نصیر محی الدین بن سید ابوصالح بن سید عبدالرزاق بن سید عبدالقادر جیلانی بن سید

محمد ابوصالح بن سید محمد موسیٰ جیلی بن سید زاہد بن سید عبداللہ بن سید یحی بن سید محمد بن سید داؤد بن موسیٰ الجولی بن عبداللہ محض بن سید شمس الدین مثنی بن امام حسنؓ بن سیدنا علیؓ بن ابی طالب۔(۹)

ولادت: شیخ مبارک بودلے کی ولادت کی تاریخ کا تعین یقینی طور پر نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ ان کی تاریخ ولادت کا تذکرہ نہ تو عبدالحیٔ حسنیؒ نے کیا ہے اور نہ ہی عبدالقادر جائسی نے، مگر ان کے دعوتی کارناموں، خلفاء نظام الدین امیٹھوی اور ملک محمد جائسی کی تواریخ ولادت اور خود ان کی تاریخ وفات کو مدنظر رکھ کر اتنا کہا جاسکتا ہے کہ وہ پندرہویں صدی عیسوی کی آخری دہائی میں پیدا ہوئے ہوں گے۔

تعلیم وتربیت: جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، شیخ مبارک بودلےؒ کے والد ماجد جوانی ہی میں انتقال کر گئے تھے اس لیے انہوں نے اپنے دادا جناب سید حاجی قتال کے زیر سایہ تعلیم حاصل کی اور انہیں کی نگرانی میں پروان چڑھے۔ چار سال کی کم سن عمر میں مکتب جانا شروع کر دیا اور سات سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے حفظ قرآن مکمل کرلیا۔ اس کے بعد علم ظاہری کی طرف متوجہ ہوئے اور بیس سال کی عمر میں تمام معقول ومنقول علوم کے حصول سے فارغ ہوئے۔(۱۰)

حج کے لیے روانگی: تعلیم سے فراغت کے بعد اپنے دادا بزرگوار کے حکم پر تقریباً پانچ سال تک افادہ واستفادہ میں مشغول رہے اور طالبان علوم نبوت کو فیض پہنچاتے رہے۔ پچیس سال کی عمر میں اپنی والدہ ماجدہ کے ساتھ حج کا قصد کیا اور حرمین شریفین میں تقریباً تین چار سال گزارے اور وہاں کے علماء سے کسب فیض کیا۔(۱۱)

شادی: جب حج بیت اللہ سے واپس آئے تو ان کی عمر تیس برس کی ہوچکی تھی اس لیے دادا بزرگوار کے حکم سے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوگئے۔(۱۲)

خلافت: تعلیم سے فراغت، حج کی ادائیگی اور پھر ازدواجی زندگی سے جڑنے کے بعد اب وقت آگیا تھا کہ وہ خلافت سے مشرف ہوں اور مسند ارشاد پر متمکن ہوں۔ چنانچہ ان کے جد امجد سید حاجی قتال نے ان کو خرقۂ خلافت عطا کیا اور طالب علموں کی تدریس، مریدوں کی تربیت اور فقراء کی خدمت کی ذمہ داری سپرد کر کے خود عبادت وریاضت میں مشغول ہوگئے۔

خلافت عطا کرتے وقت جد بزرگوار نے تاکید کی کہ سلاطین وامراء کی ملاقات سے

گریز کریں، ہمیشہ خدا پر بھروسہ رکھیں اور فقراء و طالب علموں کی خدمت کریں۔(۱۳)

اسلام کی نشر و اشاعت: خانقاہ کی ذمہ داری سنبھالنے اور مسند ارشاد پر متمکن ہونے کے بعد انہوں نے روایتی انداز میں خانقاہ میں گوشہ نشینی اختیار کرنا پسند نہ کیا بلکہ خانقاہ سے باہر نکل کر میدان عمل میں قدم رکھا اور قرب و جوار میں پھیلی ہوئی کفر و جہالت کی تاریکی دور کرنے اور اسلام کی روشنی کو مزید پھیلانے کی کوشش کی۔مختلف گھرانوں کو اسلام کے نور سے منور کیا اور کئی چیدہ اشخاص کو اسلام کا سیدھا اور سچا راستہ دکھایا جن کی نسلیں آگے چل کرامت محمد یہ کا ایک حصہ بنیں۔

کن لوگوں نے آپ کی دلی دعاؤں اور دعوتی کوششوں کے نتیجے میں اسلام قبول کیا؟ ان کے کیا نام تھے؟ ان کی کیا تعداد تھی؟ وہ کس طبقہ سے تعلق رکھتے تھے؟ اس سلسلہ میں علامہ عبدالحئی حسنیؒ نے صرف اشارہ کیا ہے کہ "**وقد أسلم على يديه جماعة من مرازبة اوده**"(۱۴) یعنی ان کے دست مبارک پر زمینداران اودھ کی ایک جماعت نے اسلام قبول کیا، البتہ اس جماعت کی قدرے تفصیل ہمیں تاریخ جائس میں ملتی ہے۔عبدالقادر خان صاحب نے تاریخ جائس میں اودھ کے پانچ ایسے اہم راجاؤں کے نام گنائے ہیں جوان کے دست مبارک پر مشرف بہ اسلام ہوئے(۱۵)۔ان پانچوں راجاؤں کے نام تاریخ کی کتابوں میں مذکور ہیں اور ان کی ریاستوں پر ایک نظر ڈالنے کے بعد کہا جاسکتا ہے کہ اسلام کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں حضرت مبارک شاہ بودلےؒ کا میدان عمل مشرق میں سلطان پور مغرب میں لکھنؤ، جنوب میں رائے بریلی و فتح پور اور شمال میں فیض آباد جیسے شہروں تک وسیع تھا۔

ان چاروں شہروں کے وسط میں پڑنے والے علاقے کی مسلم آبادی کا ایک معتد بہ حصہ ان خاندانوں اور گھرانوں پر مشتمل ہے جن کے آباء و اجداد ان کے دست مبارک پر اسلام کی دولت سے مالا مال ہوئے تھے۔ذیل میں ان پانچوں راجاؤں کا تذکرہ پیش ہے جوان کے دست مبارک پر اسلام لائے تھے۔

۱-تاتار خان کا قبول اسلام: راجپوتوں کی بچگوٹی چوہان نسل سے راجہ تاتار خان نے ان کے دست مبارک پر اسلام قبول کیا، جن کا غیر اسلامی نام تلوک چند تھا۔راجہ تاتار خاں اودھ کے سب سے طاقتور راجا تھے۔ان کی سلطنت کی حدود شمال میں دریائے گھاگرا، جنوب میں دریائے گنگا، مشرق

میں جونپور واعظم گڑھ اور مغرب میں لکھنؤ تک وسیع تھیں۔تا تارخاں کی سلطنت میں دس راجہ اور دو چودھری تھے جوان کی سیادت کو تسلیم کرتے تھے۔اس لیے کہ اودھ کے رجواڑوں میں تلکوتسو کے موقع پر قشقہ (تلک) لگا کر نئے راجہ کی تخت نشینی کے اعلان کا حق انہیں کو حاصل تھا۔(۱۶)

تا تارخان کے اسلام قبول کرنے سے سارے خطے میں ایک ہنگامہ بر پا ہو گیا اور ایسا لگا کہ جیسے راجگان اودھ کے سر پر پہاڑ ٹوٹ پڑا ہو۔بیسواڑے کے ایک راجہ دیورائے نے قسم کھائی کہ ان کی آنے والی نسل تلکوتسو کے موقع پر راجہ تا تارخاں یا ان کی اولاد کی خدمات نہیں حاصل کرے گی اورانہوں نے اپنے دوسرے لڑکے کو راجا کے لقب سے نوازا اور اپنے خاندان میں تلک لگانے کی ذمہ داری اس کے سپرد کی۔(۱۷)

باستثناء بیسواڑے کے راجہ دیورائے ،اودھ کے دیگر رجواڑوں میں تا تارخان اوران کی نسل کے سرداران قوم، جو آگے چل کر حسن پور کے دیوان کی حیثیت سے مشہور ہوئے ،کا وہی امتیاز باقی رہا جو قبل از اسلام تھا، چنانچہ ارور کے سوم بنسی سرداران ، رام پور کے بیسن ،تلوئی کے کنہپوریا اور امیٹھی کے بندھلگوٹی جب تک حسن پور کے دیوان کے ہاتھوں سے تلک نہ لگوا لیتے تھے اپنے اسلاف کے اختیارات کو استعمال کرنے کا حق نہیں رکھتے تھے۔(۱۸)

راجہ تلوک چند کے اسلام لانے کے سلسلے میں ایک غلط روایت عام ہے جسے ولیم چارلس بینٹ (W.C.Benett) نے گزیٹیئر آف اودھ کی تیسری جلد میں نقل کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ:

> ’’تلوک چند بابر کے ہم عصر تھے۔بابر نے اپنی ایک مشرقی مہم کے دوران ان کو گرفتار کرلیا اوران کو اختیار دیا کہ یا تو اسلام قبول کر کے پروانۂ آزادی حاصل کریں یا اپنے پرانے مذہب پر برقرار رہ کر غیر متعینہ مدت تک قید کی صعوبتیں برداشت کریں۔ قبول اسلام میں سبقت کرنے والی بہت سی قابل احترام شخصیات سے مشورے کے بعد جب انہوں نے اسلام قبول کر کے آزادی حاصل کرنے کو ترجیح دی تو ان کو غایت درجہ احترام کے ساتھ آزاد کر دیا گیا اور خان بہادر کے لقب سے نوازا گیا اور نام بدل کر تا تار خان رکھا گیا‘‘۔(۱۹)

پروفیسر تھامس آرنالڈ (Thomas Arnold) نے بھی مذکورہ بالا واقعے کی طرف اشارہ

کیا ہے۔مگر اس کے بعد ایک دوسرا واقعہ نقل کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''ایک روایت کے مطابق تلوک چند کو بابر نے قید کرلیا تھا اور قید سے رہائی حاصل کرنے کی غرض سے تلوک چند نے اسلام قبول کرلیا تھا۔ دوسری روایت کے مطابق تلوک چند نے ہمایوں کے عہد میں اسلام قبول کیا تھا جس کی تفصیل یہ ہے کہ ہمایوں نے جب تلوک چند کی اہلیہ کے حسن و جمال کی بڑی تعریفیں سنیں تو اسے اٹھوالیا۔لیکن جب وہ ان کے پاس لائی گئی تو ہمایوں کا ضمیر جاگ اٹھا اور اسے اپنی حرکت پر پشیمانی ہوئی۔اس نے فوراً اس کے شوہر تلوک چند کو بلوا بھیجا۔تلوک چند جنھوں نے اپنی اہلیہ کو دوبارہ نہ دیکھنے کی قسم کھائی تھی ۔ ہمایوں کا حسن سلوک دیکھ کر اس کا مذہب یعنی اسلام قبول کرلیا، جس نے اسے ایسی سخاوت اور پاکی سکھائی''۔(۲۰)

تلوک چند یعنی تاتارخاں کے تین صاحبزادے تھے ایک فتح شاہ جو قبول اسلام کے واقعے سے پہلے پیدا ہوئے تھے اور اپنے اسلاف کے قدیم مسلک پر قائم رہے، ان کی اولاد سلطان پور میں دھمور کے علاقے میں آباد تھی ۔ دوسرے صاحبزادے جلال خان اور تیسرے بازید خان تھے جو اسلام قبول کرنے کے بعد پیدا ہوئے تھے اس لیے اسلامی تربیت پائی۔انھوں نے اپنے والد کے لقب خان کی بنا پر اپنے لیے بطور فخر خانزادے کا نیا لقب اختیار کیا۔

بازید خان کے صاحبزادے حسن خان کافی شہرت اور جاہ کے مالک ہوئے۔کہا جاتا ہے کہ شیر شاہ سوری نے بنگال سے دہلی کی طرف کوچ کرنے کے دوران ان کے یہاں قیام کیا تو انھوں نے شیر شاہ کے شایان شان خاطر تواضع کی اور بیش بہا ہدیے وتحائف ان کی خدمت میں پیش کیے اور اس کے علاوہ اپنی ایک بیٹی بھی ان کے نکاح میں دی۔شیر شاہ حسن خان کی مدارات سے انتہائی خوش ہوا اور ان کو راجا کے لقب سے نوازا اور انھیں مزید اختیار دیا کہ وہ بنودھا (اودھ) کے حدود میں جس کو چاہیں راجا کے لقب سے نواز سکتے ہیں۔حسن خان نے ریوا کے راجہ کو شکست دے کر تمام اودھ میں اپنی عظمت و برتری کا احساس کرادیا تھا۔حسن خان کے بعد وہ شان وعظمت ان کے خاندان کے کسی فرد کو حاصل نہیں ہوئی، البتہ ہر ایک نے اپنی اہلیت ولیاقت اور قائدانہ صلاحیت کے لحاظ سے خاندان کی عظمت کو برقرار رکھنے کوشش کی ۔اس خاندان کے قائد حسین علی

نے ۲۲/ مارچ ۱۸۵۷ء کی سلطان پور کی جنگ میں انگریزوں کے خلاف بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور باغی فوج کی قیادت کی تھی اور اس میں ان کا ایک لڑکا بھی شہید ہوا تھا۔(۲۱)

حسن خان نے شیر شاہ سوری کے ہی دور میں حسن پور نامی ایک قصبہ آباد کیا جو سلطان پور کے مغرب میں تقریباً چار میل کے فاصلے پر، لکھنؤ، سلطان پور قومی شاہراہ کے شمال جانب آباد ہے۔ حسن پور اور منیار پور کے تعلقے آخر تک ان کی نسل میں برقرار رہے۔(۲۲)

۲- راجہ ملک پال کا قبول اسلام: سلطان پور ضلع کی بھالے سلطان نسل سے پالہن دیو نے حضرت مبارک بودلےؒ کے دست مبارک پر بہ عہد شیر شاہ سوری اسلام قبول کیا اور اپنا نام بدل کر ملک پال رکھا۔(۲۳) ولیم کروک (William Crook) نے بھالے سلطانوں کی نسل سے راجہ بارم دیو کے اسلام لانے کا تذکرہ کیا ہے۔(۲۴) جب کہ ولیم چارلس بینٹ نے رائے دود ھیچ کے قبول اسلام کا ذکر کیا ہے۔(۲۵) لیکن درحقیقت اسلام پالہن دیو نے ہی قبول کیا تھا، اس لیے کہ رائے دود ھیچ اور بارم دیو مشہور بھالے سلطان راجہ رائے برار کے صاحبزادے تھے اور ان دونوں کی اولاد اپنے قدیم ہندو مذہب پر برقرار رہی، جبکہ پالہن دیو، بارم دیو کے لڑکے تھے اور سلطان پور کے مسلم بھالے سلطان انہی کی نسل سے ہیں۔(۲۶) پالہن دیو کی نسل میں ایک مشہور راجہ نہال خان ہوئے جنہوں نے ۱۱۲۶ھ بمطابق ۱۷۱۵ء میں جگدیش پور کے پاس نہال گڑھ نامی ایک مضبوط قلعہ بنایا تھا۔ اس قلعہ کی جگہ پر آباد نہال گڑھ نامی گاؤں آج جگدیش پور میں شامل ہے اور یہاں کا ریلوے اسٹیشن انھیں کے نام پر نہال گڑھ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ نہال خان کے چچازاد بھائی مغل خان نے انہونہ کے جاگیردار کی مدد سے ۱۱۵۷ھ مطابق ۱۷۴۵ء میں نہال خان کو راج گدی حاصل کرنے کی غرض سے قتل کر دیا تھا۔(۲۷)

۳- راجہ باز سنگھ کا قبول اسلام: مشہور روایت کے مطابق راجہ باز سنگھ نے شیر شاہ سوری کے عہد میں شیخ مبارک بودلےؒ کے دست مبارک پر اسلام قبول کیا تھا۔ راجہ باز سنگھ کے دادا کرن سنگھ مین پوری پرگنہ کے بھینسول نامی قصبہ کے چوہان راجپوت سردار جگت سنگھ کے صاحبزادے تھے اور راجہ بنار شاہ کے ساتھ گڑیو کی مہم میں شریک تھے۔ فتح و کامرانی کے حصول کے بعد بنار شاہ کے صاحبزادے ٹیپوراوت کی اکلوتی صاحبزادی سے ان کی شادی کر دی گئی۔ چونکہ ٹیپوراوت کی

کوئی نرینہ اولاد نہ تھی اس لیے ان کے حصے کے بیالس گاؤں کرن سنگھ کو وراثت کے طور پر ملے، جو ان کے صاحبزادے کنور سنگھ اور پھر ان کے پوتے باز سنگھ کو منتقل ہوئے۔

جب باز سنگھ اسلام لائے تو یہ بات شاہی دربار تک پہنچے بغیر نہ رہ سکی اور شیر شاہ سوری نے ان کی قدر کرتے ہوئے خان اعظم بھینسولیان کے لقب سے نوازا۔ باز سنگھ کی اولاد خوب پھلی پھولی اور ان کے دادا کرن سنگھ کے وطن بھینسول کی نسبت سے پہلے بھینسولیان پھر آگے چل کر بھرسیاں کے نام سے معروف ہوئی۔ آئین اکبری میں ان کی نسل کا تذکرہ نومسلم چوہان کے نام سے کیا گیا ہے، جو انہونہ پرگنہ کی مالک تھی، ان کی نسل میں بہوا کا تعلقہ آخر تک برقرار رہا، جو چوبیس گاؤں پر مشتمل تھا۔(۲۸)

صاحب تاریخ جائس نے باز سنگھ کے بجائے محمد عالم خاں کے اسلام لانے کا تذکرہ کیا ہے جو غالباً باز خاں کے صاحبزادے تھے۔ لیکن دراصل محمد عالم خاں ایک صوفی بزرگ عالم تھے اور شیخ مبارک شاہ بودلےؒ کے خلفاء میں سے تھے۔ عالم خاں کے صاحبزادے بھیکھی خان نے جب گدی سنبھالی تو بھیکھی پور نامی قصبہ آباد کیا جہاں آج بھی بھرسیوں کی کثیر تعداد آباد ہے۔(۲۹)

۴- راجہ ڈینگر شاہ کا قبول اسلام: حیدر گڑھ وانہونہ کے نواح میں آباد گڑیو کی بیس راجپوت قوم سے ایک راجہ نے شیخ مبارک شاہ بودلےؒ کے دست مبارک پر اسلام قبول کیا(۳۰)۔ اس قوم سے کس شخص نے اسلام قبول کیا اس بارے میں مختلف نام اور روایات تاریخ کی کتابوں میں درج ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

نعیم اشرف جائسی نے اس خاندان کے جد اعلیٰ بنار شاہ کے پوتے ساتن رائے کے اسلام لانے کا تذکرہ کیا ہے۔(۳۱)

عبدالقادر خان جائسی نے ساتن رائے کے صاحبزادے دیا چند کے حضرت مبارک شاہ بودلے کے دست مبارک پر اسلام لانے کا تذکرہ کیا ہے۔(۳۲)

جناب اے ایف ملیٹ (A.F.Millet) نے بنار شاہ کے پڑپوتے بھرت سنگھ کے شیر شاہ کے عہد میں اسلام لانے کا تذکرہ کیا ہے۔(۳۳)

مسٹر ڈبلیو سی بینٹ (W.C. Benett) نے بھی ملیٹ کی اتباع کرتے ہوئے بھرت سنگھ

کا ہی تذکرہ کیا ہے، اوراس واقعہ کوگڑیو کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ قرار دیا ہے۔(۳۴)

بیس چھتری اتیہاس (۳۵) اوراس علاقے کی عام روایت کے مطابق جناب ڈینگر شاہ نے شیر شاہ سوری کے عہد میں حضرت مبارک بودلے کے دست مبارک پر اسلام قبول کیا تھا۔

جہاں تک ساتن رائے کا تعلق ہے تو اشرف جہاں گیر سمنانیؒ سے ان کی ملاقات کا تذکرہ لطائف اشرفی میں ملتا ہے لیکن ان کے اسلام لانے کی طرف کہیں کوئی اشارہ نہیں کیا گیا ہے، بلکہ لطائف اشرفی میں مذکور واقعہ ان کے اسلام نہ قبول کرنے پر صراحتاً دلالت کرتا ہے(۳۶) اس کے علاوہ بیس چھتری اتیہاس اور دوسرے ذرائع سے حاصل کردہ شجرہائے نسب سے پتہ چلتا ہے کہ ساتن رائے کے سارے صاحبزادگان اپنے قدیم مسلک پر قائم رہے اور اسی طرح ان کے صاحبزادے دیاچند کی اولاد بھی اپنے قدیم مذہب پر قائم رہی اس لیے ان دونوں کے اسلام لانے کا واقعہ صحیح نہیں ہے۔

جہاں تک بھرت سنگھ کا تعلق ہے تو راقم الحروف کو بنارشاہ کی اولاد کے شجرۂ نسب میں بھرت سنگھ نام کہیں بھی نظر نہیں آیا۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، بیس چھتری اتیہاس اور اس علاقے کی عام روایت کے مطابق اس خاندان سے جناب ڈینگر شاہ نے شیر شاہ سوری کے عہد میں شیخ مبارک بودلےؒ کے دست مبارک پر اسلام قبول کیا تھا، اور یہی صحیح ہے اس لیے کہ ان کی اولاد کے نام اسلامی پائے جاتے ہیں۔

یہاں پر اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ بھرت سنگھ اور ڈینگر شاہ دونوں نام ایک دوسرے کی جگہ پر استعمال ہوتے ہوئے پائے گئے ہیں اس لیے غالب گمان یہ ہے کہ بھرت سنگھ ڈینگر شاہ کا اصل نام رہا ہوگا، جیسے کہ بنارشاہ کا اصل نام پرتاپ شاہ تھا۔ اس کی تصدیق وہاب خاں اور سلامت خاں کے واجب العرض سے بھی ہوتی ہے جس میں انہوں نے ڈینگر شاہ کی جگہ پر بھرت سنگھ کا نام لکھا ہے جنہوں نے اسلام قبول کیا تھا (۳۷) جبکہ اس خاندان میں ڈینگر شاہ کے اسلام لانے کا ہی تذکرہ ملتا ہے۔

ڈینگر شاہ راقم الحروف کے جد اعلیٰ تھے اوران کی نسل لکھنؤ، سلطان پور قومی شاہراہ پر واقع قصبہ انہونہ کے جنوب مغرب میں تقریباً سات کلومیٹر کے فاصلے پر واقع موضع ساتن پوروہ اوراس

کے چھ ذیلی گاؤں میں آباد ہے، جن کے نام مندرجہ ذیل ہیں: گڑھی واصل، گڑھی اللہ داد، گڑھی محکم، گڑھی دلاور، بنگرہ اور پورے ٹھکرائن۔

۵-عجب سنگھ: صاحب تاریخ جائس نے بیسواڑے کی تلوک چندی بیس قوم کے ایک سردار کے اسلام قبول کرنے کا تذکرہ کیا ہے مگر ان کا نام ذکر نہیں کیا ہے(۳۸)۔غالبًا ان کی مراد عجب سنگھ یا ان کے تینوں لڑکوں رحمت علی، عنایت علی اور رستم علی سے ہے جو مسلمان ہو گئے تھے، مگر ان کی اولاد صحیح اسلامی تربیت و ہدایت نہ ملنے اور خاندان کے ظلم و جور کی وجہ سے پھر اپنے قدیم ہندو مسلک پر واپس آ گئی تھی۔(۳۹)

مذکورہ بالا پانچوں راجگان جو شیخ مبارک بودلےؒ کے دست مبارک پر اسلام سے مشرف ہوئے، صوبہ اودھ والہ آباد کے عمدہ ترین رؤساء میں سے تھے اور علاقے کے سب سے بااثر خانوادوں سے تعلق رکھتے تھے(۴۰)۔ان حضرات کے علاوہ دیگر اشخاص بھی ان کی کوششوں سے دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے، اس لیے کہ مذکورہ بالا راجگان کی نسل سے تعلق رکھنے والوں کے علاوہ اور بھی بہت سے گھرانے ایسے ہیں جو نومسلم ہیں اور شیخ مبارک بودلےؒ کے خانوادے سے آج بھی ارادت رکھتے ہیں، مگر چونکہ اس سلسلے میں زبانی روایات کے علاوہ اور کوئی معلومات مہیا نہیں ہیں اس لیے اسے قلم انداز کیا جاتا ہے۔

حضرت مبارک شاہ بودلےؒ کی وفات: شیخ مبارک بودلےؒ اسلام کی نشر و اشاعت اور تعلیم و تعلم سے پر ایک طویل زندگی، جو بابر، ہمایوں، شیر شاہ اور اکبر کے پرشکوہ ادوار حکومت پر محیط ہے، گزارنے کے بعد ۹۷۴ھ مطابق ۱۵۶۶ء میں اکبر کے عہد حکومت میں اس دار فانی سے کوچ کر گئے اور خانقاہ اشرفیہ، جائس کے احاطے میں اپنے دادا حاجی قتال اور والد محترم جلال اول کے پہلو میں مدفون ہوئے۔

پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی: شیخ مبارک بودلے کو اللہ تعالیٰ نے کئی اولاد سے نوازا، مگر سب ان کی زندگی ہی میں فوت ہو گئیں۔آخر کار خدا تعالیٰ کی عنایت سے ایک اور فرزند ارجمند پیدا ہوا، جس کا نام انہوں نے اپنے والد کے نام پر جلال ثانی رکھا۔شیخ جلال اپنے والد کی طرح بڑے عالی اوصاف، درویش صفت بزرگ تھے۔انہوں نے اپنی تمام عمر عبادت و

ریاضت میں بسر کی اور رشد و ہدایت کے کام میں لگے رہے ۔ جناب شاہ جلال ثانی کے سات بیٹے ہوئے جن میں سے دو یعنی شاہ مبارک ثانی اور شاہ ولی اشرف مسند ارشاد پر متمکن ہوئے ۔ شیخ مبارک شاہ بودلے کے بھائی شاہ کمال کی نسل بھی آگے پروان چڑھی اور دونوں بھائیوں کی اولادیں آج بھی جائس میں آباد ہیں (۴۱)، مگر اسلام کی نشر و اشاعت کا جوجذبہ ان کے اندر تھا وہ پھر ان کے بعد کسی میں نہ دکھا البتہ علمی تبحر کے معاملہ میں چند اشخاص کے نام گنائے جاسکتے ہیں، جنھوں نے نہ صرف اس خطہ بلکہ پورے ملک میں اپنی تعلیمی لیاقت کی وجہ سے شہرت پائی، مثال کے طور پر مولانا شاہ غلام اشرف عرف ملاباسو، مولانا سید محمد باقر فاضل جائسی اور مولانا اشرف علی عرف ملاعلی قلی جائسی ۔

شیخ مبارک بودلےؒ کے انتقال کے بعد آنے والی نسل اخلاق و اعمال کے زوال سے دوچار ہوئی ۔ ایک طرف ان کے عقائد نے ہندوستانی رنگ اختیار کیا، تو دوسری طرف ہندوستانی روایات نے اسلامی اقدار کی جگہ لینی شروع کردی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ تعلیم و تبلیغ اور ارشاد و ہدایت میں مشغول ہونے کے بجائے عرس و فاتحہ اور محرم و عزاداری کے مراسم میں الجھ کر رہ گئی اور آخر دور میں ایک ایسے نومولود مسلک کی پیروی کرنے لگی جس کی بنیاد ہی فلسفیانہ افکار اور بدعات و خرافات پر ہے ۔ اللہ تعالیٰ ان کی اولاد کو صراط مستقیم پر چلنے اور ان ہی کی طرح اسلام کی نشر و اشاعت میں خاطر خواہ حصہ لینے کی توفیق عطا فرمائے ۔

شیخ مبارک بودلےؒ کے خلفاء: شیخ مبارک بودلےؒ کے احوال و کارہائے نمایاں کے تذکرہ کے بعد یہ ضروری ہے کہ ہم شیخ کے مشہور اور اہم ترین شاگردوں و جانشینوں کا بھی ذکر کریں اس لیے کہ وہ صرف ایک صوفی بزرگ اور داعی ہی نہ تھے بلکہ ایک متبحر عالم تھے اور خلق خدا کی ایک کثیر تعداد نے ان سے استفادہ کیا (۴۲) شیخ کے شاگردوں و جانشینوں میں سے چار اہم ترین شخصیات کے نام و حالات تاریخ نے محفوظ رکھے ہیں اور وہ ہیں حضرت بندگی نظام الدین امیٹھویؒ، ملک محمد جائسیؒ، کالے پہاڑ خان اور میاں شیخ سلو نے انصاریؒ ۔ ان چاروں بزرگوں کے حالات زندگی مندرجہ ذیل ہیں:

۱- حضرت بندگی میاں نظام الدین امیٹھوی: حضرت مبارک بودلےؒ کے پہلے خلیفہ (۴۳)

اور چشتی سلسلہ کے ایک صوفی عالم وفقیہ تھے اور شیخ سری سقطی العثمانی کی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔

۹۰۰ھ مطابق ۱۴۹۴ء میں لکھنؤ سے مشرق میں واقع قصبہ امیٹھی کے ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے اور بچپن میں ہی حصول تعلیم میں لگ گئے۔ اس کے بعد جونپور کا سفر کیا اور شیخ معروف ابن عبدالواسع جونپوری کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور ایک مدت تک ان کی خدمت میں رہے، پھر مانک پور گئے اور وہاں شیخ نور بن حامد حسینی مانک پوری سے طریقت کی تعلیم حاصل کی (۴۴)۔ اس کے بعد حضرت مبارک بودلےؒ سے کسب فیض کیا اور پدرانہ شفقت بھی حاصل کی اس لیے کہ حضرت مبارک شاہ بودلےؒ انہیں اپنی اولاد کی طرح چاہتے تھے اور کبھی کبھی ان کے وطن امیٹھی میں بھی قدم رنجہ فرماتے تھے۔ (۴۵)

نظام الدین بندگی میاںؒ کی پہلی شادی مخدومہ جہاں بنت خاصہ خدا صالحی سے ہوئی تھی۔ دوسری شادی درازئی عمر کے بعد شیخ عبدالرزاق کی صاحبزادی سے کی جن سے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام جعفر رکھا۔ پہلی بیوی مخدومہ جہاں سے چھ لڑکے پیدا ہوئے جن کے نام یہ ہیں: عبدالجلیل، عبدالوہاب، عبدالواسع، محمد، احمد اور عبدالحلیم۔ پہلے تینوں صاحبزادے ان کی زندگی ہی میں انتقال کر گئے تھے۔

حضرت نظام الدین علماء ربانیین میں سے تھے اور خلق کثیر نے ان سے استفادہ کیا۔ تاحیات پورے خلوص اور حسن نیت کے ساتھ زہد وعبادت وتدریس وتلقین میں مصروف رہے اور دائمی مراقبے اور گریہ وزاری میں لگے رہے، حتی کہ کبھی کسی نے مسجد یا گھر کے علاوہ اور کسی دوسری جگہ نہیں دیکھا، البتہ کبھی کبھی شیخ نظام الدین خیرآبادی سے ملنے خیرآباد، شیخ عبدالغنی بن حسام الدین سے ملنے فتح پور اور شیخ مبارک بن شہاب سے ملنے گوپامئو جایا کرتے تھے۔ معرفت کے آثار کسی پر ظاہر نہیں کرتے تھے اور سلوک کے سلسلے میں احیاء العلوم، عوارف المعارف، رسالۂ مکیہ اور آداب المریدین جیسی کتابوں پر تکیہ کرتے تھے۔ عادت تھی کہ نماز جمعہ سے قبل چار رکعت احتیاطاً پڑھ لیا کرتے تھے، یہ بھی خصوصیت تھی کہ خطبہ میں سلاطین کا تذکرہ نہیں کرتے تھے اور شاذ ونادر ہی کسی کے ہاتھ پر بیعت کیا کرتے تھے (۴۶)۔ بزرگی اس قدر مشہور تھی کہ امیٹھی کو بندگی میاں کی امیٹھی کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اب بھی اتنی عقیدت کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے کہ علاقے سے بے دخل امیٹھیہ راجپوت

بھی جب یہاں آتے ہیں تو حضرت کی قبر پر چڑھاوا چڑھاتے ہیں۔شہنشاہ اکبر جب بنگال کو فتح کر کے واپس ہو رہا تھا تو وہ ان کی زیارت کو آیا اور مزار کے رکھ رکھاؤ کے لیے کچھ معافی زمین بھی دی تھی جو برطانوی دور میں بھی برقرار رہی۔(۴۷)

۲۸/ذی قعدہ ۹۷۹ھ مطابق ۱۵۷۲ء میں اس دار فانی سے کوچ کر گئے اور اپنے وطن امیٹھی میں مدفون ہوئے۔قبر پر تردی بیگ خاں نے ایک عالی شان عمارت بنوائی اور ان کے عزیز دوست شیخ جنید سندیلوی نے تاریخ وفات لکھی۔(۴۸)

۲- ملک محمد جائسی: شیخ مبارک بودلےؒ کے دوسرے خلیفہ اودھی (ہندی) کے صوفی شاعر ملک محمد جائسی تھے جن کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔(۴۹)

ملک محمد جائسی ۹۰۰ھ مطابق ۱۴۹۴ء کے آس پاس جائس میں پیدا ہوئے (۵۰) اور حضرت مبارک بودلےؒ سے علم و معرفت کی تحصیل کی اور ایک طویل مدت ان کی صحبت میں گزاری (۵۱) اور ان ہی کی نسبت سے جائسی نے اشرف جہاں گیر سمنانیؒ کو اپنا پیر لکھا ہے۔''سید اشرف پیر ہمارا''۔جائسی جہاں ایک طرف صوفی اصولوں سے واقفیت رکھتے تھے وہیں دوسری طرف وہ ہندو مذہب کی مشہور روایات کا بھی علم رکھتے تھے۔(۵۲)

جائسی ایک بدشکل، ایک آنکھ والے چہرے کے مالک تھے جس کا اظہار انہوں نے پدماوت میں اس طرح کیا ہے''ایک آنکھ کوی محمد گنی''۔جائسی شادی شدہ تھے اور ان کے کئی لڑکے ہوئے مگر سب کے سب مکان کی چھت گرنے کے حادثے کا شکار ہو گئے اور انتقال کر گئے۔(۵۳)

جائسی کی علمی قابلیت، فنی مہارت اور بزرگی کی وجہ سے امیٹھی (سلطانپور) کا راجہ رام سنگھ ان کا معتقد تھا اور بڑا احترام کرتا تھا۔اس کے علاوہ جائسی کو شیر شاہ سوری کا بھی اعتماد حاصل تھا۔(۵۴)

جائسی کو اللہ تعالی نے اعلی تخلیقی قوت سے نوازا تھا۔ان کی تصنیفات ہندی ادب میں اپنا خاص مقام رکھتی ہیں۔جائسی کی تصنیفات کی تعداد بیس سے زیادہ بتائی جاتی ہے۔مگر ان میں سے صرف آٹھ کا ثبوت ملتا ہے جو مندرجہ ذیل ہیں۔

پدماوت، چیناوٹ، اکھراوٹ، چتراوٹ، آخری کلام، کہرا نامہ، مہرا نامہ، مواری نامہ، مثلہ نامہ۔پدماوت میں انہوں نے چشتیہ اشرفیہ طریقت کے نو اطوار اور سات انوار کا تذکرہ کیا ہے

جولطائف اشرفی میں مذکور ہیں۔سات انوار کوسات دیپوں اورنواطوار کونوکھنڈوں سے تعبیر کیا ہے۔ دوسری کتاب چیناوٹ بھی اسی طرز پر رکھی گئی ہے۔کتاب''اکھراوٹ''ہندومت کے نکات واسرار پر مشتمل ہے۔''چتراوٹ''عورتوں کے مکروفریب اور ہوشیاری وچالاکی کے بیان میں ہے۔جبکہ آخری کلام آثار قیامت کے سلسلہ میں ہے۔جائسی صاحب فطری طور پر عابد وزاہد قسم کے انسان تھےاورخوف خدا سے لرزاں رہتے تھے(۵۵)۔۱۵۴۲ء میں وفات پائی اور امیٹھی (سلطانپور) میں مدفون ہوئے۔(۵۶)

۳-کالے پہاڑ خان: حضرت مبارک بودلے کے تیسرے خلیفہ جناب کالے پہاڑ خان تھے۔ان کا نام اصلا پہاڑ خان تھا،مگر حبشی النسل ہونے کی وجہ سے ان کی رنگت گہری سیاہ تھی،اس لیےان کے نام کے آگے کالے کا لفظ لگایا جاتا تھا۔

یہ شیر شاہی حکومت کی طرف سے صوبہ اودھ کے گورنر تھے،اوراس کے علاوہ اڑیسہ،بہار اور بنگال کی دیکھ ریکھ بھی انہیں کے سپرد تھی۔یہ حضرت مبارک بودلے سے غایت درجہ عقیدت رکھتے تھے،اوراپنے زہدوورع اورعدل گستری کی وجہ سے مقبول خاص وعام تھے۔ان کی مصلحانہ پالیسیوں کی وجہ سے بھی لوگوں میں اسلام قبول کرنے کی تحریک ہوئی،اورراجگان اودھ کو حضرت مبارک شاہ بودلےؒ سے قریب لانے میں بھی ان کا اہم کردار رہا ہے۔(۵۷)

۴-شیخ سلونے انصاریؒ: حضرت مبارک بودلےؒ کے ایک اور جانشین تھے جو میاں شیخ سلونے انصاری کے نام سے جانے جاتے تھے۔یہ ایک عالی ہمت،باشجاعت اوراعلی شخصیت کے مالک تھےاور حضرت ابوایوب انصاریؓ کی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ان کی قبر جائس کے جنوبی حصے میں انصاری محلّہ میں واقع ہے۔(۵۸)وہ ملک محمد جائسی کے ان چار دوستوں میں سے ہیں جن کا تذکرہ انھوں نے پدماوت میں کیا ہے۔جائسی ان کے بارے میں کہتے ہیں:

میاں سلونے سنگھ پر یارو بیر کھیت رن کھڑک جُھارو

ترجمہ: سلونے میاں ایک شیر دل شخص تھے،میدان جنگ میں وہ بڑی بہادری سے تلوار چلاتے تھے۔(۵۹)

شیخ مبارک بودلےؒ کے ارادت مندگان: شیخ مبارک بودلےؒ سے ارادت وعقیدت رکھنے والوں کی ایک کثیر تعداد تھی۔ذیل میں ہم چند اہم عقیدت مندوں کا تذکرہ کریں گے،جو

حضرت مبارک شاہ بودلے کی بزرگی و تبحر علمی کی وجہ سے ان کے مرید ہوگئے تھے اور بعد میں ان کی اولاد سے بھی وابستہ رہے۔

۱- پہر یموٗ و بلہ کے افغانی پٹھان: پہر یمو جائس کے جنوب مغرب میں تقریباً ستائیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے اور خطہ میں مسلمانوں کی ابتدائی آبادیوں میں سے ایک ہے۔ یہاں کے افغانی پٹھان حضرت مبارک بودلےؒ کے اہم ارادت مندگان میں سے تھے۔(۶۰)

ایک روایت کے مطابق یہ پٹھان شہاب الدین غوری (۱۲۰۶-۱۲۰۲) کے ایک سپہ سالار بھیکم خان کی نسل سے ہیں، جنہیں سلون پرگنہ کی جاگیرداری دربارشاہی سے عطا ہوئی تھی اور وہ یہیں آکر آباد ہوگئے تھے۔ چونکہ بھیکم خان کا لقب دیوان تھا اس لیے ان کی اولاد دیوان کا لقب اپنے نام کے ساتھ لگاتی رہی ہے۔(۶۱)

ایک دوسری روایت کے مطابق ایک فوج نے سید رکن الدین، سید جہاں گیر (رائے بریلی میں جہاں گیرآباد محلّہ کے بانی)، شاہ ابراہیم اور شاہ حسین کی سرکردگی میں ۶۰۳ھ مطابق ۱۲۰۶ء میں سلون پرگنہ کے بھروں کو شکست دی اور وہاں پر قابض ہوگئی۔ انہیں حضرات کے ساتھ ملک مخدوم شاہ آئے تھے جو بنورہ کے تعلقہ دار فخرالحسن کے مورث اعلی تھے اور انہیں کے ساتھ بھیکھن خان یعنی نورالدین خاں آئے تھے جو اماون اور پہر یمو کے تعلقہ داروں کے جد اعلی تھے۔(۶۲)

ایک تیسری روایت کے مطابق بابر (۱۵۳۰-۱۵۲۶) کے دربار میں بیسواڑے کے ایک مظلوم راجہ نے ایک ظالم راجہ کے خلاف استغاثہ کیا جس نے اس کے راج کو جبراً غصب کرلیا تھا۔ بابر نے اس مظلوم راجہ کا حق واپس دلانے کے لیے پانچ افغانی برادران کو متعین کیا جو مظلوم راجا کے ساتھ بیسواڑہ آئے اور ایک خونریز جنگ کے بعد ظالم راجہ کو صلح پر مجبور کیا اور مظلوم راجہ کا حق واپس دلایا۔ ریاست واپس پانے کے بعد راجہ نے پانچوں بھائیوں کو جاگیریں عطا کیں اور ان سے وہیں مستقل سکونت اختیار کرنے کی درخواست کی اور بابر کے دربار سے بھی اس کی اجازت حاصل کرلی۔ اس طرح پانچوں بھائی پہر یمو اور بلہ میں آباد ہوئے۔(۶۳)

مندرجہ بالا تینوں روایتوں میں پہلی دونوں روایات واقعہ اور زمانہ کے اعتبار سے یکساں ہیں، جبکہ اشخاص کے سلسلہ میں مختلف ہیں، تیسری اور آخری روایت زمانہ کے حساب سے پہلی دو

روایتوں سے مختلف ہے مگر اشخاص کے تعین کے سلسلہ میں دوسرے نمبر کی روایت کی تائید کرتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اصل واقعہ کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے جس کی وجہ سے پانچوں بھائیوں کو یہاں مستقل سکونت اختیار کرنی پڑی۔

ان تینوں روایتوں کے تذکرہ کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ پٹھانوں کے آباد ہونے کا زمانہ شہاب الدین غوری (۱۲۰۲-۱۲۰۶) کا عہد حکومت ہے۔

یہ پانچ بھائی تھے جو ایک مظلوم راجہ کی مدد کی خاطر آئے تھے اور ان پانچوں بھائیوں کے نام صراحتاً دوسری روایت میں مذکور ہیں۔

دوسری روایت کے مطابق ملک مخدوم شاہ بنورہ کے تعلق داران کے مورث اعلی تھے اور بھیکھن خان یعنی نور الدین خان اماون، پہر یمو وبلہ کے افغان پٹھانوں کے مورث اعلی تھے۔

چونکہ ان پٹھانوں کی ریاست ایک طرف کنہوریا راجپوتوں اور دوسری طرف بیسوں کی ریاستوں کے بیچ میں تھی اس لیے ان کو دونوں طرف سے حملوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا، البتہ بیسوں کے بمقابلہ کنہوریا سے ان کا سامنا زیادہ رہتا تھا اور کبھی ہار تو کبھی جیت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ جب تلوئی کے کنہوریا راجہ کاندھے رائے نے اپنی ریاست کی توسیع اور لوٹ مار کی غرض سے پہر یمو پر حملہ کیا تو یہاں کے پٹھان قائد معین خان نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا اور کاندھے رائے کو زخمی کر کے زبردست شکست دی، مگر خود بھی جام شہادت نوش کیا (۶۴)۔ امیٹھی کے راجہ موہن سنگھ نے اپنے عہد عروج میں ۱۷۰۷ء میں پہر یمو کو فتح کر لیا تھا اور یہ علاقہ نوابی کے قیام تک اس کے زیر نگیں رہا۔ (۶۵)

لکھنؤ کے نوابوں کے عہد میں پٹھانوں نے راحت کی سانس لی مگر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران انہیں پھر مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ انگریزی حکومت کے قیام کے بعد پہر یمو کی ریاست پھر سے ایک تعلقہ کی شکل میں ان کی ملکیت میں آ گئی جو سترہ گاؤں اور ایک محل پر مشتمل تھی۔ (۶۶)

۲-نواب جہاں دار خان کانکڑ: نواب صاحب افغانی پٹھان تھے اور حضرت مبارک بودلے کے اہم ترین ارادت مندگان میں سے تھے۔ حافظ قرآن تھے اور متقی و پرہیزگار شخصیت کے مالک تھے اور ہمایوں بادشاہ کے امراء میں سے تھے۔ ہمایوں کی شکست کے بعد جب شیر شاہ

مالک تخت وتاج ہوا، تو اس نے مخالفت کی معافی کے ساتھ ساتھ ان کے جاہ ومنصب میں اضافہ کی بھی پیش کش کی مگر انہوں نے اپنے آقا کی دشمن کی رفاقت کو موجب ننگ وعار اور خلاف شرافت سمجھا اور شیر شاہ کی پیشکش کو قبول نہ کیا۔ جب ہمایوں نے دوبارہ سلطنت حاصل کر لی اور اکبر سلطنت کا مالک ہوا، تو نواب جہاں دار خاں اور ان کے بھائیوں کو وفاداری کا خوب خوب صلہ دیا اور وہ پنج ہزاری، ہفت ہزاری اور چند ہزاری کے مناصب سے سرفراز ہوئے۔

ان کے ایک بھائی نواب موسی خان نے کالپی کے قریب موسی نگر نامی قصبہ آباد کیا اور دوسرے بھائی کانکڑ خاں نے کڑا کے قریب کانکڑ آباد بسایا۔ نواب جہاں دار خان نے رائے بریلی سے متصل مغربی جانب ایک شاہی قلعہ پختہ شہر پناہ کے ساتھ تعمیر کیا، جس میں دکان اور بازار مرتب انداز میں تعمیر کرائے۔ اس کے علاوہ شمال کی جانب جہان آباد کا قصبہ آباد کیا، جہاں پر وہ مدفون ہوئے۔ قصبہ جائس کی جامع مسجد خانقاہ اشرفیہ جائس کا احاطہ، عیدگاہ والی مسجد اور حضرت میر عمادالدین قلیچی کا مقبرہ بھی انہی نے تعمیر کرایا تھا۔ (۶۷)

۳۔ضلع اٹاوہ کے افغانی زمیندار: ضلع اٹاوہ کا افغانی زمیندار گھرانہ جو اپنی شجاعت، جواں مردی اور مہمان نوازی میں مشہور تھا شیخ مبارک بودلے کا ارادت مند تھا۔ (۶۸)

۴۔علمائے نگلامی: شیخ مبارک بودلے کے ارادت مندوں میں جائس کا ایک نمایاں علمی خانوادہ بھی ہے جس کے علماء ''علماء نگلامی'' کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ یہ خانوادہ جائس کے محلّہ غوریانہ میں آباد تھا اور اس خاندان کے مورث اعلی حضرت شیخ نظام الدین نگلامی اپنے وقت کے ایک معروف عالم دین تھے اور ان چالیس علماء میں سے ایک تھے جو ۵۶۱ھ مطابق ۱۱۵۶ء میں خواجہ معین الدین چشتیؒ کے ساتھ بعہد سلطان شمس الدین التمش ہندوستان تشریف لائے تھے۔

جب خواجہ معین الدین چشتیؒ کے ساتھ آنے واے علماء کی جماعت نے اسلام کی نشر و اشاعت کی غرض سے ہندوستان کے مختلف گوشوں کا رخ کیا تو شیخ نے ہندوستان کے مشرقی حصہ کا رخ کیا اور جائس میں پہنچ کر سکونت اختیار کی۔ سلطان محمد غوری کے وزیر خواجہ موید الملک شیخ نگلامی کے ہم درس و ہم مکتب تھے اس لیے سلطان ان کا بھی بڑا خیال رکھتا تھا۔

ان کی ایک تصنیف مجموعہ نظامیہ کے نام سے معروف ہے جس میں شہاب الدین محمد غوری

اورخواجہ مویدالملک کی مدح میں عربی زبان میں بہت سے اشعار ہیں۔ جہاں تک شیخ نگلامی کے حسب ونسب کا تعلق ہے تو ان کا سلسلہ نسب حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ملتا ہے۔

شیخ نگلامی کی نسل میں آگے چل کر بڑے بڑے علماء وفضلاء پیدا ہوئے جو اپنے تبحر علمی اور درا کی کے سبب دہلی سلطنت، عہد مغلیہ اور پھر برطانوی دور میں اعلی مناصب سے سرفراز ہوئے۔ ان میں چند کے نام اس طرح ہیں: ضیاءالدین نگلامی، ملا داؤد نگلامی، شیخ عبدالعزیز نگلامی، مولوی واصل علی خاں نگلامی اور جناب عبدالقادر خاں جائسی۔ضیاءالدین نگلامی فیروز شاہ تغلق کے زمانہ میں بنارس کے حاکم تھے، شیخ عبدالعزیز نگلامی عہد اکبری میں اپنے علمی تبحر کی وجہ سے دربار شاہی سے منسلک تھے، ملا داؤد نگلامی عہد عالمگیری کے ایک جید عالم تھے۔ مولوی واصل علی خاں اٹھارویں صدی کے جیداور صاحب تصنیف عالم گزرے ہیں۔لارڈ وارن ہنگر کے زمانہ میں کلکتہ کے قاضی القضاۃ (Chief Justice) مقرر ہوئے اور''ذخیرۂ گورنر ہنگر'' کے نام سے مسائل و قوانین شریعت کو ترتیب دے کر یکجا کیا، اس کے علاوہ بنارس کے بھی حاکم شہر وعدالت مقرر ہوئے۔ وہ حضرت شاہ سید اشرف جہاں سجادہ نشین آستانہ اشرفی جائسی کے مرید تھے۔

واصل علی خان کے صاحبزادے عبدالقادر خان بھی ایک صاحب تصنیف عالم اور اچھے مدیر ومنتظم کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ پہلے وہ اپنے والد بزرگوار کی جگہ پر بنارس کے قاضی متعین ہوئے اس کے بعد میر منشی کے عہدے پر فائز ہوئے اور جان تھامس کے مشیر کی حیثیت سے کام کیا۔ انگریزی حکومت نے ان کی دانائی کو دیکھتے ہوئے نیپال میں اپنا سفیر بنا کر بھیجا جہاں انہوں نے قابل قدر خدمات انجام دیں۔ نیپال سے واپسی پر مدبری کا عہدہ تفویض کیا گیا اور گراں قدر تنخواہ متعین کی گئی۔ان تمام سرگرمیوں کے باوجود انہوں نے مختلف کتابیں تصنیف کیں جن میں سے تین کا پتہ چلتا ہے جو مندرجہ ذیل ہیں:

تاریخ نیپال: یہ انہوں نے نیپال میں قیام کے دوران لکھی تھی۔

حشمت کشمیر: یہ کشمیر کے تاریخ کے بیان میں ہے۔

تاریخ جائس: یہ کتاب جائس میں آباد خانوادۂ اشرفیہ کے سجادہ نشینوں کے تذکرہ میں ہے اوراس میں انہوں نے مبارک شاہ بودلے سے اپنے خاندان کی ارادت کا تذکرہ کیا ہے اور وہ خود

بھی خانوادۂ اشرفیہ کے ایک سجادہ نشین جناب غفور اشرف صاحب کے مرید تھے(۶۹)۔ زیر نظر مقالہ کی تیاری میں راقم الحروف نے اس کتاب سے کافی مدد لی ہے۔

خاتمہ: شیخ مبارک بودلےؒ کی زندگی پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے اور اشاعت اسلام کی کاوشوں کے مختصر جائزے اور خلفاء و ارادت مندگان کے بارے میں پڑھنے کے بعد ان کی عظمت و بزرگی کا اعتراف مسلم ہوجاتا ہے، اتنی عظیم ہستی کا اب تک پردۂ خفا میں رہنا تعجب کی بات ہے اور مسلم تذکرہ و سیرت نگاروں اور خود حضرت کے خانوادے کے علماء کی بے اعتنائی اور بے توجہی پر دلالت کرتا ہے۔ اپنی تمام کاوشوں کے باوجود مجھے یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں محسوس ہوتا کہ یہ مختصر مقالہ حضرت کے تذکرے کے لیے ناکافی ہے۔ ان کی زندگی پر مزید تحقیق کرنے اور دعوتی کارناموں پر مزید روشنی ڈالنے کی ہنوز ضرورت ہے۔

حوالہ جات

(۱) ان کی بے مبالغہ اور معتدل سیرت کے لیے ملاحظہ ہو ''تاریخ دعوت و عزیمت''، ج ۱، از مفکر اسلام سید ابو الحسن علی ندویؒ، مطبوعہ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ۔ (۲) ان کی سیرت کے مطالعہ کے لیے ملاحظہ ہو ''بزم صوفیاء'' از صباح الدین عبدالرحمٰن، مطبوعہ معارف پریس اعظم گڑھ۔ (۳) یمنی، نظام الدین، لطائف اشرفی، مخدوم اشرف اکیڈمی، کچھوچھہ، ص ۵۶ (۴) ایضاً ص ۱۵۔ (۵) سید، اقبال احمد، تاریخ شیراز ہند جونپور، مطبع نامی پریس، لکھنؤ، ۱۹۸۳ء، ص ۵۷۹-۵۸۰۔ (۶) خان، عبدالقادر جائسی، تاریخ جائس (قلمی) نسخہ کتب خانہ ندوۃ العلماء، لکھنؤ، ص ۶۔ (۷) میرے سامنے اس وقت پدماوت کے دو نسخے ہیں، ایک اردو رسم الخط میں ہے جو مع ترجمہ پنڈت بھگوتی پرشاد کے ترجمے کے ساتھ مطبع نول کشور، لکھنؤ سے شائع ہوا ہے اور دوسرا دیوناگری رسم الخط میں ہے جو ڈاکٹر ماتا پرشاد گپت کی تحقیق و ترجمے کے ساتھ نومبر ۱۹۶۳ء میں بھارتی بھنڈار پریس الہ آباد سے شائع ہوا ہے۔ اشعار مع ترجمہ اول الذکر سے ماخوذ ہیں مگر اس میں ''مبارک'' کی جگہ پر ''محمد'' لکھا ہوا ہے، جبکہ موخر الذکر میں جو کہ پدماوت کے مختلف نسخوں سے رجوع کرنے کے بعد تیار کیا گیا ہے، ''مبارک'' ہی لکھا ہوا ہے، ملاحظہ ہو صفحہ ۱۴۔ (۸) جائسی، ملک محمد، پدماوت، مطبع نول کشور، لکھنؤ، ص ۹۔ ۹) یمنی، نظام الدین، لطائف اشرفی، مخدوم اشرف اکیڈمی، کچھوچھہ، ص ۱۴۔ (۱۰) خان، عبدالقادر جائسی، تاریخ جائس (قلمی)، ذاتی لائبریری مولانا سلمان اشرف، ص ۶، (ندوۃ العلماء کے نسخہ میں حفظ کا تذکرہ نہیں ہے اس لیے مغالطہ ہوتا ہے کہ آپ نے ۹ ہی سال کی عمر میں تمام معقول و منقول علوم حاصل کر لیے تھے جو صحیح نہیں ہے، ص ۶)۔ (۱۱) خان، عبدالقادر جائسی، تاریخ جائس (قلمی) نسخہ کتب خانہ ندوۃ العلماء، ص ۸۔ (۱۲) ایضاً۔ (۱۳) ایضاً۔ (۱۴) الحسنی، عبدالحئی، نزہۃ الخواطر ج ۴، دار ابن حزم، بیروت، ۱۹۹۹ء، ص ۴۰۱-۴۰۲۔ (۱۵) خان، عبدالقادر جائسی، تاریخ جائس (قلمی) نسخہ کتب خانہ ندوۃ العلماء، ص ۲۲-۲۳۔ (۱۶) ایضاً ص ۲۳۔

(۱۷) Elliot, Charles Alfred, The Chronicles of Oonao, Allahabad Mission Press, Allahabad (1862), Page No.70

(۱۸) Crook, William, The Tribes and Castes of the North Western Provinces and Oudh, vol 1,Office of the Superintendent of Government Printing, Calcutta, (1896), Page No.95

(۱۹) Benett, William Charles, Gazetteer of the Province of Oudh Vol. 3, North Western Provinces and Oudh Government Press, Allahabad, (1878) Page No.465

(۲۰) Arnold, Thomas, The Spread of Islam in the World, Good Books, New Delhi,(2008) Page No.259-260

(۲۱) Benett, William Charles, Gazetteer of the Province of Oudh Vol. 3, North Western Provinces and Oudh Government Press, Allahabad, (1878) Page No.466-468

(۲۲) Benett, William Charles, Gazetteer of the Province of Oudh Vol. 2, North Western Provinces and Oudh Government Press, Allahabad, (1877) Page No.76

(۲۳) خان، عبدالقادر جائسی، تاریخ جائس (قلمی) نسخہ کتب خانہ ندوۃ العلماء ص ۳۲۔

(۲۴) Crook, William, The Tribes and Castes of the North Western Provinces and Oudh, vol 1,Office of the Superintendent of Government Printing, Calcutta, (1896), Page No.254-255

(۲۵) Benett, W.C., A Report on the Family History of the Chief Clans of the Roy Bareilly District, the Oudh Government Press, Lucknow, (1870), Page No.23

(۲۶) Millet, A.F. Report on the Settlement of the Land Revenue of Sultanpur District, the Oudh Government Press, Lucknow (1873), Page No.182

(۲۷) ایضاً، ص ۱۸۱۔ (۲۸) ایضاً، ص ۱۷۸۔ (۲۹) خان، عبدالقادر جائسی، تاریخ جائس (قلمی) نسخہ کتب خانہ ندوۃ العلماء، ص ۳۶۔ (۳۰) ایضاً، ص ۳۷۔ (۳۱) جائسی، مولانا نعیم اشرف، محبوب یزدانی، دارالعلوم جائس، جائس، ۲۰۰۹ء

ص۶۱۔(۳۲)خان،عبدالقادر جائسی،تاریخ جائس(قلمی)نسخہ کتب خانہ ندوۃ العلماء،ص۳۸۔

(۳۳) Millet, A.F., Report on the Settlement of the Land Revenue of Sultanpur District, the Oudh Government Press, Lucknow, (1873), Page No.177

(۳۴) Benett, William Charles, Gazetteer of the Province of Oudh Vol. 3, North Western Provinces and Oudh Government Press, Allahabad, (1878) Page No.461

(۳۵)سنگھ،بھگوان وتس،بیس چھتری اتہاس،نول کشور پریس۱۹۹۳ء،ص۱۶۵۔(۳۶)یمنی،نظام الدین،لطائف اشرفی، لطیفہ نمبر۵۷،ص ۶۲۸۔(۳۷)خان عبدالوہاب،وسلامت،واجب العرض،دلیش بندھو پریس،بارہ بنکی،۱۹۲۵ء،ص۱۔ (۳۸)خان،عبدالقادر جائسی،تاریخ جائس(قلمی)نسخہ کتب خانہ ندوۃ العلماء،ص۲۳۔(۳۹)سنگھ،بھگوان وتس،بیس چھتری اتہاس،نول کشور پریس،۱۹۹۳ء،ص۱۷۳۔(۴۰)خان،عبدالقادر جائسی،تاریخ جائس(قلمی)نسخہ کتب خانہ ندوۃ العلماء،ص۲۳۔(۴۱)ایضاء،ص۴۶۔(۴۲)الحسنی،عبدالحئ،نزہۃ الخواطر،ج۴،دارابن حزم،بیروت،۱۹۹۹ء،ص۴۰۲-۴۰۱۔(۴۳)خان،عبدالقادر جائسی،تاریخ جائس(قلمی)نسخہ کتب خانہ ندوۃ العلماء،ص۱۱۔(۴۴)الحسنی،عبدالحئ،نزہۃ الخواطر،ج۴،دارابن حزم،بیروت،۱۹۹۹ء،ص۴۴۵۔(۴۵)خان،عبدالقادر جائسی،تاریخ جائس(قلمی)نسخہ کتب خانہ ندوۃ العلماء،ص۱۲۔(۴۶)الحسنی،عبدالحئ،نزہۃ الخواطر،ج۴،دارابن حزم،بیروت،۱۹۹۹ء،ص۴۴۵۔

(۴۷) Benett, William Charles, Gazetteer of the Province of Oudh Vol. 1, North Provinces and Oudh Government Press, Allahabad, (1878) Page No.42-43

(۴۸)الحسنی،عبدالحئ،نزہۃ الخواطر،ج۴،دارابن حزم،بیروت،۱۹۹۹ء،ص۴۴۵۔(۴۹)خان،عبدالقادر جائسی،تاریخ جائس(قلمی)نسخہ کتب خانہ ندوۃ العلماء،ص۱۳۔(۵۰)کھیل چند آنند،ہندی ساہتیہ کا سمیچھاتمک اتیہاس،جی لال اینڈ کمپنی،نئی دہلی،ص۳۷۔(۵۱)الحسنی،عبدالحئ،نزہۃ الخواطر،ج۴،دارابن حزم،بیروت،۱۹۹۹ء،ص۴۲۰۔(۵۲)کھیل چند آنند،ہندی ساہتیہ کا سمیچھاتمک اتیہاس،جی لال اینڈ کمپنی،نئی دہلی،ص۳۷۔(۵۳)ایضا۔(۵۴)ایضا۔(۵۵) خان،عبدالقادر جائسی،تاریخ جائس(قلمی)نسخہ کتب خانہ ندوۃ العلماء،ص۱۸-۱۵۔(۵۶)کھیل چند آنند،ہندی ساہتیہ کا سمیچھاتمک اتیہاس،جی لال اینڈ کمپنی،نئی دہلی،ص۳۷۔(۵۷)خان،عبدالقادر جائسی،تاریخ جائس(قلمی) نسخہ کتب خانہ ندوۃ العلماء،ص۲۲۔(۵۸)ایضا،ص۴۳۔(۵۹)جائسی،ملک محمد،پدماوت،مطبع نول کشور،لکھنؤ،ص ۱۱۔(۶۰)خان،عبدالقادر جائسی،تاریخ جائس(قلمی)نسخہ کتب خانہ ندوۃ العلماء،ص۳۷۔

(۶۱) Nevill, H.R., Rai Bareli: A Gazetteer, Vol XXXIX of District

Gazetteers of the United Provinces of Agra and Oudh, F. Luker, Supdt. Govt. Press, Allahabad, (1905),Page No.97

(۶۲) Macandrew, Major J. F., Report of the Settlement Operations of the Rai Bareli District, Oudh Government Press Lucknow,(1872), (Index K) Page No.6

(۶۳) خان،عبدالقادر جائسی،تاریخ جائس (قلمی) نسخہ کتب خانہ ندوۃ العلماء،ص۴۲-۳۹۔

(۶۴) Benett, W.C., A Report on the Family History of the Chief Clans of the Roy Bareilly District, the Oudh Government Press, Lucknow, (1870), Page No.29

(۶۵) ایضاً،ص ۳۹۔ (۶۶) ایضاً،ص ۵۹۔ (۶۷) خان،عبدالقادر جائسی،تاریخ جائس (قلمی) نسخہ کتب خانہ ندوۃ العلماء،ص۴۴-۴۲۔ (۶۸) ایضاً،ص۴۲۔ (۶۹) رضوی،زینت زہراء،جائس کے علمی وادبی خدمات،مقالہ برائے پی ایچ ڈی،شعبۂ اردو،الہ آباد یونیورسٹی،الہ آباد،۱۹۹۵ء،ص۸۴-۷۶۔

کتابیات: اردو مصادر

سید،اقبال احمد،تاریخ شیراز ہند جونپور،مطبع نامی پریس لکھنؤ،۱۹۸۳ء۔

رضوی،زینت زہراء،جائس کے علمی وادبی خدمات،مقالہ برائے پی ایچ ڈی،شعبۂ اردو،الہ آباد یونیورسٹی،الہ آباد، ۱۹۹۵ء۔

جائسی،مولانا نعیم اشرف،محبوب یزدانی،دارالعلوم جائس،جائس،۲۰۰۹ء۔

یمنی،نظام الدین،لطائف اشرفی،لطیفہ نمبر ۵۷،ناشر،شہر،سنہ غیر مذکور۔

یمنی،نظام الدین،لطائف اشرفی،مخدوم اشرف اکیڈمی،کچھوچھہ۔

خان عبدالوہاب،وسلامت،واجب العرض،دیش بندھو پریس،بارہ بنکی،۱۹۲۵ء۔

عربی،فارسی،ہندی مصادر

الحسنی،عبدالحئی،نزہۃ الخواطر،ج۴،دارابن حزم،بیروت،۱۹۹۹ء۔(عربی)

خان،عبدالقادر جائسی،تاریخ جائس (قلمی) نسخہ کتب خانہ ندوۃ العلماء،لکھنؤ۔(فارسی)

خان،عبدالقادر جائسی،تاریخ جائس (قلمی) نسخہ ذاتی لائبریری مولانا سلمان اشرف جائسی،جائس۔(فارسی)

جائسی،ملک محمد،پدماوت،مطبع نول کشور،لکھنؤ۔(اردو رسم الخط،اودھی رہندی)

جائسی،ملک محمد،پدماوت،تحقیق وترجمہ ڈاکٹر ماتا پرساد گپت،بھارتی بھنڈار پریس،الہ آباد،۱۹۶۳ء،(دیوناگری رسم الخط،

اودھی/ہندی)

سنگھ، بھگوان وتس، بیس چھتری اتہاس، نول کشور پریس، ۱۹۹۳ء۔ (ہندی)

کھیل چند آنند، ہندی ساہتیہ کا سمیچھاتمک اتہاس، جی لال اینڈ کمپنی، نئی دہلی۔ (ہندی)

انگریزی مصادر

Elliot, Charles Alfred, The Chronicles of Oonao, Allahabad Mission Press, Allahabad (1862).

Crook, William, The Tribes and Castes of the North Western Provinces and Oudh, vol 1,Office of the Superintendent of Government Printing, Calcutta, (1896).

Benett, William Charles, Gazetteer of the Province of Oudh Vol. 3, North Western Provinces and Oudh Government Press, Allahabad, (1878).

Arnold, Thomas, The Spread of Islam in the World, Good Books, New Delhi,(2008).

Benett, William Charles, Gazetteer of the Province of Oudh Vol. 2, North Western Provinces and Oudh Government Press, Allahabad, (1877).

Benett, W.C., A Report on the Family History of the Chief Clans of the Roy Bareilly District, the Oudh Government Press, Lucknow,(1870).

Millet, A.F., Report on the Settlement of the Land Revenue of Sultanpur District, the Oudh Government Press, Lucknow, (1873).

Benett, William Charles, Gazetteer of the Province of Oudh Vol. 1, North Western Provinces and Oudh Government Press, Allahabad, (1878).

Nevill, H.R., Rai Bareli: A Gazetteer, Vol XXXIX of District Gazetteers of the United Provinces of Agra and Oudh, F. Luker, Supdt. Govt. Press, Allahabad, (1905).

Macandrew, Major J. F., Report of the Settlement Operations of the Rai Bareli District, Oudh Government Press Lucknow,(1872), (Index K) .

اخبار علمیہ

''الوفاء بشرح الاصطفا من اسماء المصطفیٰ کی اشاعت''

یہ دسویں صدی ہجری کے ازہری عالم علامہ عبدالباسط البلقینی کی کتاب ہے۔ ۱۱۷/اشعار پر مشتمل ایک قصیدہ ہے جس میں آنحضورؐ کے پانچ سو سے زائد ذاتی اور صفاتی اسماء کا تذکرہ ہے۔ مولف نے پہلے اس قصیدہ کو''الاصطفا من اسماء المصطفیٰ'' کے نام سے موسوم کیا، پھر ان ناموں کی وضاحت اور اس کے غریب الفاظ کی شرح لکھی، اعراب لگائے تو اس کا نام''الوفاء بشرح الاصطفاء'' رکھا۔ ایک اور ازہری عالم محمد نعیم الدین نے مصنف کے خط کے اس مخطوطہ کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا اور اس تحقیق وتخریج پر معہد البحوث والدراسات العربیۃ، قاہرہ نے ڈاکٹریٹ کی سند تفویض کی۔ محقق نے صاحب کتاب کے حالات وسوانح بھی تحریر کیے ہیں، بعض اسماء ایسے ہیں جو نقلاً و روایۃً ثابت نہیں ہیں مگر ان کو آپؐ کے صفاتی اسماء میں شامل کیا گیا ہے۔ محقق نے اس موضوع پر لکھی گئی دوسری کتابوں کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ اس کا پہلا اڈیشن دار الضیاء۔ کویت سے اسی سال شائع ہوا ہے۔ اس میں کل صفحات ۷۷۰ ہیں۔ (اخبار المرکز، دسمبر ۱۳، عدد ۵۸، ص ۱۸)

''نقش پا کی دریافت''

برطانوی سائنس دانوں کو نورفوک کاؤنٹی میں ابتدائی انسانوں کے نقوش پا ملے ہیں جن کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ یہ براعظم یورپ میں آٹھ لاکھ سال پہلے آباد ہونے والے باشندوں کے ہیں۔ اس سے قبل نورفوک کے شمالی حصہ میں ساحل پر ۵۰ انسانی قدموں کے نشانات ملے تھے مگر سمندری لہروں کے سبب یہ جلد ہی غائب ہوگئے، اس وقت ان کو ڈیجیٹل کیمرہ میں قید کرلیا گیا تھا۔ تجزیاتی رپورٹ کے مطابق ان کی بناوٹ آج کے انسانوں کے پیروں کے مشابہ ہے، انگلیوں کے نشان میں بھی فرق نہیں۔ ۲۰۱۰ء میں اسی علاقہ سے قدیم انسانوں کے استعمال شدہ پتھروں کے اوزار ملے تھے، یورپ میں انسانی ارتقاء کے متعلق ملنے والا یہ پہلا ثبوت ہے۔ سائنس دانوں کے بیان کے مطابق اس دریافت سے لگتا ہے کہ قدیم ترین انسان کا قد بھی ہمارے جیسا تھا۔ ماہرین آثار قدیمہ کے مطابق یہ دریافت انسان کے ارتقاء اور اس کے جسمانی

اور ماحولیاتی سلسلہ کا پتہ لگانے میں معاون ہوگی۔ (تفصیلی رپورٹ وائس آف امریکہ ۰۸ ۱۷ اردو ۹؍فروری ۱۴ء پر دیکھی جاسکتی ہے)

''کرکیومن سے سرطان کا علاج''

''کینسر پری وینشن جنرل میں شائع تحقیق میں کہا گیا ہے کہ ہلدی سرطان جیسے موذی مرض کے خلاف لڑنے کی طاقت رکھتی ہے، سائنس دانوں کے مطابق ہلدی میں قدرتی طور پر پائے جانے والے کیمیائی مادے ''کرکیومن'' میں کینسر زدہ خلیات کے علاج کی صلاحیت موجود ہے، انہوں نے ۲؍ملی میٹر لمبے کیپسول میں ۲۰۰ ملی گرام کرکیومن رکھ کر ٹیومر زدہ چوہوں پر اس کا تجربہ کیا، ایک گروپ کے چوہوں کو دو کیپسول اور دوسرے کو ہلدی والے کھانے کھلائے گئے اور چار مہینے تک ٹیومر بڑھنے کی رفتار کا معائنہ کیا جاتا رہا۔ معلوم ہوا بہ طور غذا استعمال ہونے والی ہلدی نے ان پر کوئی اثر نہیں ڈالا، لیکن کیپسول لینے والے چوہوں کی رسولیوں کا سائز سکڑ کر ایک تہائی کم ہوگیا اور سرطانی خلیات بننے کا عمل بھی سست پڑ گیا۔ اس سے محققین نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ چونکہ ہلدی ہارمون کے ان اثرات کو مسدود کرتی ہے جو سرطان کی گلٹیاں بننے میں مدد کرتے ہیں۔ اس لیے یہ کینسر کے علاج میں موثر کردار ادا کرسکتی ہے۔ (وائس آف امریکہ، ۱۱؍فروری ۱۴ء)

''بچوں پر منفی اثرات''

جنرل ''سوسائٹیز'' میں شائع ہونے والی تحقیق کے مطابق خطرناک محلوں میں پرورش پانے والے بچوں میں جارحانہ رویہ کا امکان بہت زیادہ ہوتا ہے۔ یہ تحقیق اس لحاظ سے اہم ہے کہ بین الاقوامی مطالعہ میں پہلی بار بچوں کے مقام پرورش اور رویے کے درمیان تعلق کی نشان دہی کی گئی ہے۔ تحقیق میں دنیا کے نوممالک چین، کولمبیا، اٹلی، کینیا، فلپائن، سویڈن، تھائی لینڈ اور امریکہ سے ۱۲۹۳ خاندانوں کو شامل کیا گیا تھا، محققین نے جارحانہ رویے کی پیمائش کے لیے بچوں کے اشتعال انگیز جذبات مثلاً دوسرے بچوں کو دھمکی، دھونس اور چیخنے چلانے کی عادتوں کا اندراج کیا تھا، انہوں نے والدین سے ان کے محلوں کے متعلق معلومات حاصل کرکے ان کے جوابات کی روشنی میں خطرے کی سطح کا تعین کیا، جن محلوں کو والدین نے بہت زیادہ پر خطر بتایا تھا، ان میں

رہنے والے بچوں کے رویے میں اشتعال اور لڑائی، جھگڑے کا عنصر زیادہ نظر آیا۔ تحقیق کے نتیجہ میں یہ بات بھی سامنے آئی کہ خطرناک محلّہ کے منفی اثرات بچوں کو بالواسطہ یا والدین کے ذریعہ متاثر کرتے ہیں کیونکہ ان محلوں میں بچوں کے ساتھ والدین کا سخت رویہ عام ہے جس سے بچے جذباتی طور پر مشتعل ہوجاتے ہیں۔ (وائس آف امریکہ، ۲۸؍ جنوری ۱۴ء)

''علمی مباحث اور قدیم نصوص کے طریقۂ تحقیق پر لکچر''

عمان کے پروفیسر مصطفیٰ عبدالقادر نجار نے ''علمی مباحث اور قدیم نصوص کے طریقۂ تحقیق وتوثیق'' کے موضوع پر ایک لکچر میں کہا کہ تاریخ قلم بند کرنے میں قدیم مخطوطات اور وثائق کو بنیادی ماخذ ومصدر کی حیثیت حاصل ہوتی ہے، اس لیے جس علاقہ وزبان کی تاریخ لکھی گئی ہو اس سے وطنی اور لسانی نسبت رکھنے والے مورخین کا کام زیادہ معتبر اور قابل استناد ہوتا ہے۔ باقی ایسے محققین یا مصنّفین جو ضرورت، سیاحت یا کسی خاص نقطۂ نظر سے تاریخ لکھتے وقت مخطوطات و وثائق کا استعمال کرتے ہیں ان کی معلومات ناقص ہوتی ہے اور نتائج میں غلطیوں کا احتمال زیادہ ہوتا ہے۔ اس لیے محقق کو چاہیے کہ متعدد مصادر کو سامنے رکھ کر ان میں باہم موازانہ، مطالعہ اور تحلیل وتجزیہ کی کوشش کرے تاکہ صحیح وغلط واضح ہوجائے، پروفیسر موصوف نے ۳۷ سے زائد کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ان کی جدید ترین کتاب ''تذکرات شیخ المورخین العرب'' ہے جو ان کی خود نوشت ہے۔ (اخبار المرکز، دسمبر ۱۳ء، عدد ۵۸، ص ۹)

''لرنس ٹفٹ (قلم)''

جرمنی کی ایک کمپنی نے حال ہی میں ''لرنس ٹفٹ'' نامی ایک ایسا قلم ایجاد کیا ہے، جس میں تلفظ اور لغوی لحاظ سے غلط لفظوں کی اصلاح کی صلاحیت ہے، اس میں اندرونی طور پر ایسے حساس آلات نصب کیے گئے ہیں جو ہجے اور قواعد کے اعتبار سے غلط لفظوں کو رقم کرتے وقت قلم میں ارتعاش پیدا کرنے لگتے ہیں، کمپنی کا کہنا ہے کہ یہ قلم صحیح انگریزی سکھانے میں معاون ہوگا، اس کا استعمال بھی بچوں بوڑھوں سب کے لیے آسان ہوگا۔ (منصف، حیدرآباد، ۱۳ء، ص ۱۱)

ک، ص اصلاحی

معارف کی ڈاک

''شہزادی جہاں آرا بیگم......''

اسلام آباد

۱۷/فروری ۲۰۱۴ء

معارف فروری ۲۰۱۴ء میں ڈاکٹر حنا یاسمین کے مضمون ''شہزادی جہاں آرا بیگم......'' میں لفظ ''صوفی'' کی جمع بجا طور پر ''صوفیہ'' لکھی گئی ہے (جب کہ آج کل اکثر لکھنے والے غلط طور پر اس کی جمع ''صوفیا'' لکھتے ہیں)۔لیکن ایک جگہ ترکیب بناتے ہوئے ڈاکٹر صاحبہ بھی ''صوفیائے کرام'' لکھ گئی ہیں (ص ۱۳۳، سطر ۴)۔حالانکہ یہاں بھی ''صوفیہ کرام'' ہونا چاہیے تھا۔یہ ایسے ہی جیسے ''صحابی'' کی جمع ''صحابہ'' کی ترکیب بناتے ہوئے ''صحابائے کرام'' لکھ دیا جائے! ایسی اغلاط اگر مضمون نگار کر بھی جائیں تو یہ رسالہ کے ایڈیٹر کی ذمہ داری ہے کہ وہ مقالے کی نوک پلک اور املائی مسائل ٹھیک کر دے۔

عارف نوشاہی

آثار علمیہ وتاریخیہ

تعطیل جمعہ کے سلسلہ میں علامہ شبلی کی ایک نادر تحریر

اشتیاق احمد ظلی

اسلام اور مسلمانوں کے لیے دل سوزی اور دردمندی علامہ شبلی کی طبیعت ثانیہ تھی۔اسی طرح دین اور ملت کے لیے غیرت اور حمیت کا جذبہ ان کے اندر بدرجہ اتم موجود تھا۔یہی وجہ ہے کہ علم وتحقیق اور تصنیف وتالیف کے علاوہ، جوان کا اصل میدانِ کار تھا،ان کی قومی خدمات بھی غیر معمولی اہمیت کی حامل ہیں۔ جب کہیں اور جہاں کہیں بھی اسلام اور مسلمانوں کو زک پہنچتی وہ بے قرار ہوجاتے اور اس کے تدارک کے لیے کمر بستہ ہوجاتے اور اپنی بیماری اور معذوری کے باوجود اس سلسلہ میں کوئی دقیقہ اٹھانہیں رکھتے تھے۔ان کی مختصر زندگی میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ یہ ان کی زندگی کا ایک ایسا روشن پہلو ہے جس کی نظیر اس دور کے زمرہ علماء میں ملنی مشکل ہے۔اس سلسلہ میں وقف علی الاولاد کی بحالی کے لیے ان کی پرزور مہم کو پیش کیا جاسکتا ہے۔اس مہم کو کامیاب بنانے کے لیے انہوں نے ایک بڑی منظّم اور طویل جدو جہد کی۔اس زمانہ میں ایک بڑا مسئلہ نماز جمعہ کا تھا۔دفاتر اور اسکولوں میں اوقات کار اس طرح تھے کہ مسلمانوں کو نماز جمعہ ادا کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔اس طرح وہ ایک اہم دینی فریضہ کی ادائیگی سے محروم رہ جاتے تھے۔یہ کوئی نیا مسئلہ نہیں تھا بلکہ اپنی پوری سنگینی کے ساتھ اس وقت سے موجود تھا جب سے ملک پر انگریزوں کا تسلط قائم ہوا تھا۔لیکن نماز جمعہ کی اہمیت اور فرضیت کے باوجود اس وقت تک کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں دی تھی اور یہ سعادت بھی علامہ شبلی کے لیے مقدر تھی۔وقف علی الاولاد کے معاملہ میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد انہوں نے اس مسئلہ کی طرف توجہ دی۔وہ چاہتے تھے کہ یہ مسئلہ بھی اس طرح پیش کیا جائے کہ اس کی معقولیت،اہمیت اور ضرورت میں شک وشبہ کی گنجائش باقی نہ رہ جائے۔اس سلسلہ میں

انہوں نے سب سے پہلے اپریل ۱۹۱۲ء میں ندوۃ العلماء کے سالانہ اجلاس میں جو لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا، ایک ریزولیوشن پیش کیا جو منظور ہوگیا۔ اس کی روشنی میں انہوں نے ایک یادداشت مرتب کی۔ اس میں آٹھ دفعات کے تحت تعطیل جمعہ کے مطالبہ کی وضاحت کی اور محکم دلائل سے اس کی ضرورت کو ثابت کیا (۱)۔ اس یادداشت کی بنیاد پر انگریزی میں ایک میموریل تیار کیا گیا۔ علامہ کا یہ خیال تھا کہ ''جب تک وقف اولاد کی طرح متحدہ اور وسیع طریقہ سے باضابطہ کارروائی نہ کی جائے گی کامیابی نہ ہوگی'' (۲)۔ اس میموریل پر بڑے پیمانے پر دستخط حاصل کرنے کا پروگرام تھا۔ اس مہم کے اخراجات کے لیے جو نشانہ مقرر کیا گیا تھا وہ بآسانی پورا ہوگیا۔ کام شروع ہو چکا تھا کہ اسی دوران بنگال کونسل کے ایک ممبر مسٹر غزنوی (۳) نے کونسل میں اس کے متعلق سوال کیا۔ حکومت کی طرف سے نہ صرف یہ کہ اس سوال کا تشفی بخش جواب دیا گیا بلکہ جمعہ کے لیے دو گھنٹہ کی چھٹی بھی منظور کر لی گئی (۴)۔ اب سوال یہ تھا کہ اس بدلی ہوئی صورت حال کے پیش نظر اس تحریک کو آگے بڑھانے کی ضرورت باقی تھی یا نہیں۔ جو لوگ یہ سمجھتے تھے کہ اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہی ان میں مسٹر شفیع، بیرسٹر لاہور کا نام شامل تھا۔ خواجہ غلام السیدین کا خیال تھا کہ اس مہم میں کامیابی ممکن نہیں۔ لیکن بعض دوسرے اہل الرای جن کے نام دستیاب نہیں، اس رائے سے اتفاق نہیں رکھتے تھے۔ اور سمجھتے تھے کہ یہ مسئلہ کا حل نہیں ہے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ شبلی کی بھی یہی رائے تھی (۵)۔ چنانچہ یہی طے پایا کہ بہتر اور مستقل حل کے لیے تحریک کو جاری رکھا جائے۔ چنانچہ علامہ شبلی نے ایک اور میموریل تیار کیا جس میں بنگال گورنمنٹ کے حکم کے حوالہ سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ نماز جمعہ کے لیے دو گھنٹہ کی تعطیل کے بجائے ایک بجے سے آدھے دن کی تعطیل کی جائے۔ اس میں ان ممکنہ نقصانات اور خطرات کا بھی ذکر کیا گیا تھا جو دو گھنٹہ کی تعطیل میں مضمر تھے۔ یہ میموریل 'حیات شبلی' میں محفوظ ہے (۶)۔ البتہ علامہ شبلی کا ایک مراسلہ جو اسی تناظر میں لکھا گیا تھا نہ تو 'حیات شبلی' میں موجود ہے نہ کسی اور ماخذ میں اس کا ذکر ہے۔ یہ مراسلہ ۲۹ اپریل ۱۹۱۳ء کو روزنامہ 'زمیندار' لاہور میں شائع ہوا تھا۔ یہ مراسلہ غالباً اس وقت لکھا گیا تھا جب حکومت بنگال کے فیصلہ کے پس منظر میں تحریک کو ختم کر دینے یا جاری رکھنے کے سلسلہ میں دونوں طرح کی رائیں سامنے آ رہی تھیں۔ اس لیے اس سلسلہ میں کسی حتمی فیصلہ تک پہنچنے سے پہلے انہوں نے یہ ضروری سمجھا کہ اس کے بارے میں بڑے پیمانہ پر اہل الرای کے خیالات معلوم کر لیے جائیں۔ اس مراسلہ کی محتویات سے

واضح طور پر یہ بات ابھر کر سامنے آتی ہے کہ علامہ شبلی نہ صرف یہ کہ دو گھنٹہ کی چھٹی کو کافی نہیں سمجھتے تھے بلکہ بحیثیت مجموعی اسے مضر خیال کرتے تھے۔ یہ کارروائی جاری تھی کہ علامہ شبلی کا انتقال ہو گیا اور بات جہاں تک پہنچی تھی وہیں رہ گئی۔ ان کے انتقال کے بعد اس تحریک کو آگے بڑھانے کے لیے کوئی سامنے نہیں آیا۔ البتہ اس سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ اکثر صوبوں میں ملازمین اور طلبہ کے لیے نماز جمعہ کی ادائیگی کی صورت پیدا ہو گئی (۷)۔ یہ مراسلہ تعطیل جمعہ کے ایک اہم مرحلہ سے تعلق رکھتا ہے۔ علامہ کی اس نادر تحریر کے لیے ہم مولانا عمر اسلم اصلاحی صاحب، استاد مدرسۃ الاصلاح کے شکر گزار ہیں۔

تعطیل جمعہ

مسٹر غزنوی کے سوال کا گورنمنٹ کی طرف سے جو جواب دیا گیا اس کے بعد تعطیل جمعہ (نصف روز) کی ضرورت ہے یا نہیں۔

مسلمان ایک مدت سے اس بات کو محسوس کرتے تھے کہ جمعہ کے دن سرکاری عدالتوں کے کھلے رہنے سے مسلمان ملازموں کو عملاً ایک فرض مذہبی کے ادا کرنے سے باز رہنا پڑتا ہے، چنانچہ ایک دو سال سے اس کے متعلق مسلمانوں نے کوشش شروع کی۔ مسٹر غزنوی کی تحریک وسعی سے گورنمنٹ بنگال نے دو گھنٹہ کی چھٹی منظور کی۔ حال میں مسٹر غزنوی کے سوال پر گورنمنٹ ممبر نے کونسل میں کہا کہ گورنمنٹ بخوشی اس بات کو منظور کرے گی کہ جو مسلمان ملازم جمعہ کی نماز ادا کرنے کے لیے چھٹی طلب کرے اس کو اجازت دی جائے۔

اس کارروائی سے بعضوں کو اطمینان ہو گیا ہے کہ جمعہ کی تعطیل (نصف روز) کی تحریک کی ضرورت نہیں رہی، لیکن بہت سے لوگ ایسے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ اس کارروائی نے اصل مسئلہ کو حل نہیں کیا۔

گورنمنٹ کی طرف سے جو جواب دیا گیا ہے اس کا مطلب بظاہر یہ ہے کہ جب کوئی مسلمان اپنے افسر سے جمعہ کے دن نماز کے لیے چھٹی طلب کرے گا وہ اس کو چھٹی دے دے گا، لیکن یہ اجازت اور دو گھنٹہ کی عام تعطیل دو مختلف باتیں ہیں۔

اجازت کے حکم کا منشا یہ ہے کہ ہر ملازم کو ہر دفعہ جمعہ کے دن اجازت طلب کرنی پڑے گی۔ اس صورت میں یہ ظاہر ہے کہ خاص خاص حالات میں اکثر ملازموں کو خود اجازت طلب کرنے میں

تامل ہوگا مثلاً جب وہ دیکھے گا کہ اس کا افسر مسلمان نہیں ہے اور اس کو کسی کی مذہبی پابندی کی بہ نسبت دفتر کے کام کے پورا ہونے کا زیادہ لحاظ ہوگا، اس صورت میں گو ملازم کو یہ یقین ہوگا کہ اجازت بہر حال مل جائے گی تاہم اس کو بار بار اجازت طلب کرنے میں پھر بھی تامل ہوگا۔ بخلاف اس کے معلوم ہو کہ مسلمانوں کو جمعہ کے دن عام اجازت ہے تو بے تکلف ہر شخص اس اجازت سے مستفیض ہو سکے گا۔

اس کے علاوہ مسلمانوں کی اصلی خواہش یہ ہے کہ یہ دو گھنٹہ کی چھٹی مسلمان ملازموں کے ساتھ مخصوص نہ رہے بلکہ عام طور پر جمعہ کے دن آدھے دن کی تعطیل دے دی جائے۔ اس لیے کہ اگر یہ تعطیل مسلمانوں کے ساتھ مخصوص رہی تو مسلمان ملازموں کو یہ اندیشہ رہے گا کہ غیر مسلمان افسر ہمیشہ مسلمان ملازموں کو اپنی ماتحتی میں لینا پسند نہ کریں گے کیونکہ ان کو ہمیشہ یہ نظر آئے گا کہ ہر آٹھویں دن ایسے ملازموں کی وجہ سے سرکاری کاموں کے انجام دینے میں دو گھنٹے ضائع ہو جاتے ہیں۔

ان وجوہ کی بنا پر ہم تمام اسلامی اخبارات اور اہل الرای حضرات سے متدعی ہیں کہ وہ بہ تفصیل و توضیح اس امر کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کریں۔ کیا گورنمنٹ کی معرفت اور محتاجِ اعادہ اجازت پر قناعت کرنی چاہیے یا عام تعطیل کی درخواست کرنی چاہیے اور یہ کہ اس پر اکتفا کرنا چاہیے کہ یہ نصف روزہ تعطیل مسلمانوں کے ساتھ مخصوص رہے یا عام کر دی جائے۔

شبلی نعمانی

(روزنامہ زمیندار، ۱۰ اپریل ۱۹۱۳)

حواشی

(۱) علامہ شبلی، مقالات شبلی، مرتبہ سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ ۲۰۱۰، ۳۸/۸-۳۹۔ نیز دیکھیے مولانا سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، ۱۹۹۹، ص ۵۰-۵۴۹۔ (۲) مکاتیب شبلی، مرتبہ سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۱۹۴/۱۔ (۳) مسٹر غزنوی کے سلسلہ میں معلومات دستیاب نہیں۔ (۴) حیات شبلی، ص ۵۵۰۔ (۵) مکاتیب شبلی، ۱۹۵/۱؛ حیات شبلی، ص ۵۱-۵۵۰۔ (۶) حیات شبلی، ص ۵۲-۵۵۱۔ (۷) ایضاً، ص ۵۵۲۔

مطبوعات جدیدہ

تجلیات قرآن: ازمولانا سید جلال الدین عمری، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۵۶۰، قیمت ۳۰۰ روپے، پتہ: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، ڈی ۳۰۷ دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵۔

قرآن مجید کے بے شمار اوصاف میں ایک اس کا نور ہونا ہے، ایسا نور جس کی تجلیات کا کامل احاطہ گو ممکن نہیں لیکن اس کی کوششیں ہر دور میں ہوتی رہی ہیں اور اقتباس و اکتساب نور کا یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔ زیر نظر کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، فاضل مصنف کی علمی و قلمی زندگی، قرآن مجید کی نور افشانی سے خاص طور پر منور رہی ہے، قرآن مجید کی عظمت، اس کی تعلیمات، اصطلاحات اور اس کے متعلقات پر ان کا قلم مسلسل قرآن مجید کی خدمت میں مصروف و مشغول رہا، ان کی یہ تحریریں مختلف رسائل میں قرآن فہمی کے نئے گوشے وا کرتی رہیں، اس کتاب میں ان تمام متفرق مضامین کو مختلف عناوین کے تحت بڑے سلیقے سے تین ابواب میں پیش کیا گیا ہے، فاضل مصنف نے ابتدا ہی میں واضح کردیا کہ دین کی بنیاد، قرآن مجید ہے اور سیرت و احادیث نبویؐ اس کی تشریح و تفسیر ہیں، اس مرکزی عقیدہ کی روشنی ہی میں یہ سارے مباحث ہیں، خاص بات ان مضامین کی زبان اور اسلوب ہے، زبان سادہ اور عام فہم اور اسلوب دعوتی اور تبلیغی، اس لیے ان میں تاثیر کی خوبی بھی بدرجہ اتم ہے، بڑی عمدہ بات آگئی کہ انسان اور کتاب اللہ کے درمیان اگر فکری خواہشات کے پردے پڑے ہوں تو پھر ممکن نہیں کہ حق کی روشنی اس کی فکری دنیا تک پہنچ سکے، قرآن مجید سے استفادہ کی شرط اول جذبۂ اطاعت ہے، اگر دل اس جذبے سے خالی ہے تو پھر یہ اپنے مطالب اس پر نہیں کھولتی، فاضل مصنف کے مطالعہ کی ایک اور صفت اس کی کلامی شان ہے، قرآن مجید کے منکرین و معترضین کے شبہات و اعتراضات کا رد اسی صفت کا نتیجہ ہے۔ ایک باب قرآنی مطالعات کے عنوان سے ہے جس میں مفسرین صحابہ کرامؓ اور مولانا فراہیؒ کے طریقۂ تفسیر پر بھی مفید گفتگو میں کہا گیا کہ مولانا فراہیؒ کے ہاں قدیم مفسرین کے حوالے کم ملتے ہیں لیکن بقول مصنف، حقیقت یہ ہے کہ مولانا کے پیش نظر تفسیر کی تمام اہم اور متداول کتابیں رہی

ہیں لیکن وہ کسی رائے کو محض اس لیے قبول نہیں کرتے کہ وہ کسی بڑے مفسر کی رائے ہے بلکہ وہ اس بنیاد پر چلتے ہیں کہ ھم رجال و نحن رجال ۔ یہ اختصار، بہرحال تفصیل کا طالب ہے، اسی طرح مولانا صدرالدین اصلاحی کی تیسیر القرآن کے متعلق بھی ایک تعارفی مضمون ہے۔

تفسیر ماجدی، نقد و نظر: از مولوی نعیم الرحمٰن صدیقی ندوی، متوسط تقطیع، کاغذ و طباعت عمدہ، مجلد، صفحات ۲۹۶، قیمت ۲۵۰ روپے، پتہ: مکتبۃ الشباب العلمیہ، شباب مارکیٹ، ندوہ روڈ، لکھنؤ-۲۰۔

قرآن مجید کے فہم اور اس کی ترجمانی کے باب میں مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے نام، کام اور مفسرین میں ان کے مقام کی شہرت و وقعت ایسی ہے کہ اس کے تعارف کی ضرورت ہی نہیں، مولانا کی ہشت پہل بلکہ جامع کمالات شخصیت کا ہر پہلو، نمایاں اور ممتاز ہے لیکن ان کی زندگی کا اصل سرمایہ ان کی قرآنی خدمات ہیں، خصوصاً ان کی تفسیر کی پاکیزہ زبان، بلیغ تعبیرات، جامع مضامین و مطالب اور قرآنی حقائق کی سہل ممتنع انداز سے تفہیم کو ارباب نظر نے خاص امتیازات کی حیثیت سے یاد کیا ہے، عصر حاضر خصوصاً مغربی افکار و نظریات اور یہود و نصاریٰ کے متعلق تاریخی تفصیلات کا تقابلی موازنہ جس انداز سے تفسیر ماجدی میں ہے وہ بقول مولانا قاری طیب قاسمی، ''بلاشبہ ان ہی کا حصہ ہے'' اور قریب قریب یہی اظہار حقیقت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے قلم سے سامنے آیا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ تفسیر قابل ہزار قدر دینی و قرآنی خدمت کی حامل ہے۔ تفسیر ماجدی کی قدر و قیمت کا اندازہ تو اس کے براہ راست مطالعہ ہی سے ہوسکتا ہے لیکن ارباب نظر کی نظر میں اس کے جو امتیازات ہیں وہ تقریب مطالعہ کے لیے بھی اپنی افادیت کے باعث اتنے ہی ضروری ہیں، غالباً اسی مقصد سے اس کتاب میں مشاہیر علماء و فضلاء کے مضامین یکجا کیے گئے ہیں، قاری طیب صاحب، مولانا علی میاں، مولانا منظور نعمانی، مولانا اویس نگرامی، مولانا سعید اکبرآبادی، مولانا عبداللہ عباس ندوی رحمہم اللہ اور مولانا سید محمد رابع ندوی، پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی، پروفیسر عبدالرحیم قدوائی، ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی جیسے علوم قرآنی کے ماہرین کی تحریریں بجائے خود قرآنیات کے باب میں بہت وقیع اور مفید ہیں، لائق مرتب نے ان کو جمع کرنے کا قابل تحسین فریضہ ہی انجام نہیں دیا، خود ان کے قلم سے دو عمدہ

تحریریں، مولانا دریابادی کی تفسیری خصوصیات اور سورۂ فاتحہ کے ترجمہ ماجدی کے چند معاصر تراجم کے مختصر تجزیاتی مطالعہ کے عنوان سے آ گئی ہیں، تفسیر پر چند تبصرے بھی نقل کیے گئے ہیں ان میں ایک معارف میں مرزا احسان بیگ مرحوم کے قلم سے ہے اور یہ گویا نایاب تھا، اس کتاب کی برکت سے ایک بار پھر عام افادہ کا ذریعہ بن گیا۔ تفسیر ماجدی کے شائقین کے لیے یہ کتاب یقیناً مرحلۂ شوق کے طے ہونے میں مددگار ثابت ہوگی۔

جواہر الحکم کامل : از مولانا سید محمد بدر عالم مدنی، متوسط تقطیع، کاغذ و طباعت مناسب، مجلد، صفحات ۴۱۶، قیمت ۱۱ بار درود ابراہیمیؑ کا نذرانہ، پتہ: ۱۵۸، بیت البدر، مہاجر کالونی، عظیم روڈ، بھاول نگر پاکستان۔

صاحب فیض الباری اور ترجمان السنہ مولانا بدر عالم میرٹھی، گذشتہ صدی کے نامور علماء کی صف میں ایک انفرادی شان رکھتے تھے، خصوصاً علم حدیث سے ان کے اشتغال نے ان کی ذات اور ان کے کمالات کو مرجعیت و قبولیت کی نعمت عطا کی، مولانا انور شاہ کشمیری سے تلمذ اور دیوبند اور ڈابھیل میں ان کے علمی و دینی فیضان کی بڑی دلکش تصویر و تاریخ ہے، تقسیم ہند کے بعد وہ پاکستان منتقل ہو گئے، پاکستان کے دستور اسلامی کی تدوین و ترتیب میں وہ بھی شریک رہے۔ بعد میں وہ مدینہ منورہ ہجرت کر گئے، یہ علم حدیث کی ان کی مسلسل خدمات کا ایسا صلہ تھا جس پر خدا جانے کتنوں کو رشک آیا ہو، ۶۵ میں انہوں نے جنت البقیع کے بقعہ مبارکہ کی آغوش میں آسودگی کی دولت پائی۔ بدر عالم تو غروب ہو گیا لیکن روشنی اب تک پھیلی ہے، اسی روشنی کی ایک کرن زیر نظر کتاب ہے جس میں احادیث نبویؐ کا ایسا انتخاب ہے جو عام چہل حدیث کے جمع و انتخاب کی روایت سے اس لیے جدا ہے کہ اس میں معاصر دور کے اجتماعی مسائل اور شریعت کے نفاذ میں درپیش مسائل کے حل کو مدنظر رکھا گیا ہے، اس نہایت دلکش اور مفید ترین مجموعہ احادیث کی تشریح و توضیح بھی بڑی موثر اور دلآویز ہے، عام قارئین کے علاوہ یہ ہمارے خطیبوں اور واعظوں کے لیے بھی بہت کارآمد ہے، کتاب میں ایک حصہ مولانا بدر عالم کے سوانح کا بھی ہے جس کو حافظ محمد اکبر شاہ بخاری نے عمدگی سے مرتب کیا ہے۔ اس طبع جدید کی اشاعت بہر سعادت ہے، البتہ عرض ناشر میں کتابت کی کئی غلطیاں ہیں، مسرور کی جگہ مصرور، ممنون کی جگہ ممنوع اور فوقل

ادب اور نذرانہ کی بجائے نظرانہ لکھا جانا تکلیف دہ ہے۔

حسرت موہانی، حیات وخدمات: مرتبہ جناب شاہد ماہلی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۳۲۲، قیمت ۲۰۰ روپے، پتہ: غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوان غالب مارگ، نئی دہلی-۲۔

شعر حسرت کی شیرینی، لطف ولذت اور اس کی واقعیت وصداقت میں شاید ہی اردو کے کسی ناقد کو شک ہو، خود شاعر کے میزان نقد میں مزہ کو امتیاز یوں حاصل ہوا کہ اگر ابوالکلام کی نثر نہ دیکھی جائے تو پھر نظم حسرت میں مزہ کی کیفیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ حسرت کی اصل شناخت، ان کی شاعری ہے لیکن صحافت، سیاست، تنقید، تذکرہ نگاری ان کے وہ اوصاف ہیں جو ان کی قلندری اور طرفہ تماشا طبیعت کے امتزاج سے ان کی شخصیت کو ایسے رنگ عطا کرتے ہیں جو حد درجہ پرکشش اور جاذب قلب ونظر بن جاتے ہیں، زمانہ نے ایسوں کو کم ہی دیکھا ہوگا جو صوفی ومجذوب بھی ہوں اور باغی وانقلابی بھی ہوں، مومن وموحد کا اشتراکی ہونے کا علانیہ اقرار، شخصیت کی خودداری وبے نیازی کے جوہری کردار ہی سے ممکن ہے۔ ایسی ہمہ رنگ شخصیت کا تقاضا تھا کہ اس کی یاد کے ذریعہ کلاسیکی ادب، تعمیری سیاست، صداقت پر مبنی سیاست اور استغنا، بے باکی اور جرأت سے مزین انسانیت کو یاد کیا جائے، خوشی کی بات ہے کہ غالب انسٹی ٹیوٹ نے اس فریضہ کی ضرورت واہمیت کو محسوس کیا اور ایسے دور میں جب ادب وشعر کی خلعت کم قامتوں کو عطا کرنے کی ایک روش قائم کی جارہی ہے، حسرت کی یاد میں ایک وقیع سمینار کا انعقاد کیا، اس کتاب میں اسی سمینار کے منتخب مقالات جمع کیے گئے، شمیم حنفی، عابد رضا بیدار، حکیم ظل الرحمٰن، عزیز الدین حسین، علی احمد فاطمی، ارتضٰی کریم، خالد علوی، قمر الہدیٰ فریدی، مولیٰ بخش، آفتاب احمد آفاقی، ضیاء الرحمٰن صدیقی جیسے معتبر شرکاء نے حسرت کے مطالعہ کا حق ادا کیا، ہر مضمون پڑھنے کے لائق ہے، شمیم حنفی کے مضمون میں چھوٹے چھوٹے جملے بڑی بڑی بحثوں کا عنوان بن سکتے ہیں۔ کیسا خوبصورت جملہ ہے کہ ''حسرت کی زندگی پر ایک ناقابل یقین افسانے کا گمان ہوتا ہے'' یا یہ کہ ''حسرت کی زندگی اور شاعری دونوں کو کسی بیرونی سہارے کی، کسی آرائش کی حاجت نہیں''، لیکن اصل مضمون تو بیدار صاحب کا ہے، مکمل سیر حاصل، مضمون کیا بجائے خود ایک کتاب

ہے، جس نے رشید احمد صدیقی کے ان الفاظ کو یاد ہی نہیں دلایا، ان الفاظ کے درد کو بھی تازہ کردیا کہ ''کتنے شعراء کے کارناموں کو حسرت نے ہر طرح کی مجبوری و بے سروسامانی کے باوجود دوام بخشا، اس کا اندازہ آج اردو کے دور ابتلا و آزمائش میں کرتا ہوں تو حسرت کی یاد میں دل بے قرار ہوجاتا ہے''۔ اس کتاب نے یہ تو کیا کہ بہتوں کے دل کی بے قراری کو قرار بخش دیا۔ ایسی عمدہ کتاب کے لیے جناب شاہد ماہلی اور غالب انسٹی ٹیوٹ ہم سب کے شکریہ کے مستحق ہیں۔

محمد بن حسن رومی خاں: از جناب اسلم مرزا، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، صفحات ۸۰، قیمت ۱۲۵ روپے، پتہ: مرزا ورلڈ بک ہاؤس، نزد درگاہ نظام الدین، قیصر کالونی، اورنگ آباد مہاراشٹر اور اورنگ آباد، ناگپور، مالیگاؤں، ممبئی، الہ آباد اور احمد نگر کے کئی مکتبے۔

آئینہ معنی نما، عطر گل مہتاب، گلدستہ خوش باس اور سلاطین دکن کے عہد میں شادیاں جیسی عمدہ کتابوں کے مصنف اور ان کے بلند پایہ علمی و تحقیقی اور ادبی و شعری ذوق سے قارئین معارف ناآشنا نہیں، ان کی بعض کتابوں کا ذکر ان صفحات میں آچکا ہے، ہمیشہ کی طرح اس کتاب میں بھی انہوں نے تاریخ کا ایک ایسا صفحہ پلٹا ہے جس پر نگاہ کم کی گئی یا غالباً اس پر نظر ہی نہیں پڑی، محمد بن حسن رومی خاں احمد نگر سلطنت کے برہان نظام شاہ کے عہد میں یعنی ۱۵۱۰ء میں فوجی سے زیادہ ایک ماہر توپ ساز کی شکل میں نظر آتے ہیں، وہ میر آتش تھے، اس وقت کار آتش کس قدر جوان تھا، یہ کتاب اسی عہد آتشیں کی حرارت بخش داستان بن گئی ہے، رومی خاں کی ایک توپ ملک میدان تھی، اس کے تعمیری راز کو پانے کے لیے حوصلہ مندوں نے کیا کیا کوششیں کیں؟ یہ بیان بہت دلچسپ ہے، اسلامی ہندوستان کی عظمت رفتہ کے احساس کو اس مختصر کتاب نے بہت بڑا بنا دیا، کیسی توپ ڈھالی گئی تھی جس کو کھینچنے اور بقول مصنف ڈھونے کے لیے چار سو بیل، دس ہاتھی اور بے شمار سپاہی کئی دن تک مصروف رہے۔ احمد نگر میں اب بھی اس فوجی شان و شوکت کے آثار موجود ہیں، اس کی کچھ تصویریں بھی دی گئی ہیں، اس طرح یہ کتاب ہمارے ماضی کا ایک آئینہ بن گئی ہے۔ باقی مصنف نے سچ کہا کہ رہے نام اللہ کا۔ ایک مختصر سی کتاب کو سنوارنے کے لیے جس تحقیقی مہارت سے کام لیا گیا ہے، کتابیات اس کا ثبوت ہے۔ ع-ص

رسید مطبوعات جدیدہ

۱- ترجمان القرآن الکریم وتفہیم القرآن : ترجمہ وتفسیر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، مرتب احمد ابوسعید، اردو بک ریویو دریا گنج، نئی دہلی۔ ہدیہ =/۲۰۰ روپے

۲- ٹمل ناڈو کے رباعی گو شعراء کا شناخت نامہ : علیم صبا نویدی، ڈاکٹر جاوید ہ حبیب، ۲۶/۱۴۳، امیر النساء بیگم اسٹریٹ، چینائی۔ قیمت =/۴۰۰ روپے

۳- حکایت ہستی (خود نوشت سوانح عمری) : مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی، قاری جمیل احمد امام مسجد، عثمان نالہ پار، بھیونڈی، مکتبہ شیخ الہند، مدرسہ شیخ الہند، انجان شہید (قاسم آباد)، اعظم گڑھ۔ قیمت =/۱۵۰ روپے

۴- ر (رے) : تحقیق وترتیب، محمد یوسف رحیم بیدری، مصنف محمد یوسف رحیم بیدری، ۱۴۸/ ۲-۵، دوسری منزل، گولہ خانہ، پتال نگری، بیدر۔ قیمت =/۱۲۰ روپے

۵- سماج کو بہتر بنائیے : مفتی تنظیم عالم قاسمی، دارالعلوم سبیل السلام، حیدرآباد۔ قیمت =/۱۰۰ روپے

۶- طناب (مضامین، تبصرے، تقریظ، شخصیات اور رپوتاژ) : محمد یوسف رحیم بیدری، مکان نمبر ۱۴۸-۲-۵، دوسری منزل، گولہ خانہ، پتال نگری، بیدر۔ قیمت =/۱۲۵ روپے

۷- فتاوی ندوۃ العلماء (جلد دوم) : ترتیب وتحقیق منور سلطان ندوی، مجلس صحافت و نشریات اسلام، ندوۃ العلماء، ٹیگور مارگ، پوسٹ بکس نمبر ۹۳، لکھنؤ۔ قیمت =/۴۰۰ روپے

۸- معمار قوم ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی : مولانا مفتی عطاء اللہ قاسمی، شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی۔ قیمت =/۳۰۰ روپے

۹- مفسر قرآن وداعی احسان حضرت مولانا سید شاہ صبغۃ اللہ حسینی بختیاریؒ : مولف ڈاکٹر سید کمال اللہ بختیار ندوی، مدرسہ باقیات صالحات، ویلور ٹمل ناڈو۔ قیمت =/۷۵ روپے

۱۰- ن (نون) (افسانچے) : محمد یوسف رحیم بیدری، مکان نمبر ۱۴۸-۲-۵، دوسری منزل، گولہ خانہ، پتال نگری، بیدر۔ قیمت =/۱۲۰ روپے